۴

جوہرِ آئینہ

یعنی

جائزۂ کلامِ غالب

مصنفہٗ

نندلال کول طالب کاشمیری

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

طالب کاشمیری

پہلی بار ۱۰۰۰

تاریخ طباعت سنہ ۱۹۷۱ء

سرورق : ودّیا رتن آرٹسٹ جمّوں

قیمت بارہ روپے

ملنے کے پتے:-

(۱) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ - جامعہ نگر - نئی دہلی ۲۵
(۲) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ - اُردو بازار جامع مسجد دہلی ۶
(۳) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ - پرنسس بلڈنگ - نزدجے جے ہسپتال بمبئی ۳
(۴) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ - شمشاد مارکیٹ - مسلم یونیورسٹی - علی گڑھ
(۵) مکتبۂ گلزار ابراہیم - پتھر مسجد - سری نگر۔
(۶) شیخ غلام محمد - شاہین بک اسٹال - مائسمہ بازار - سری نگر
(۷) کپور برادرس - لال چوک - سری نگر۔
(۸) طالب بھون - دھرم ارتھ روڈ - سری نگر

(مطبوعہ جمال پریس دہلی ۶)

فہرست مضامین

مرزا اور دیگر شعرائے کلام میں مماثلت و ہم آہنگی [1]

مرزا کے حامیوں اور مخالفوں کے درمیان ان کی شاعری کا جو پہلو زیادہ تر ادبی معرکہ آرائیوں کا موضوعِ بحث رہا ہے اور جس کی صدائے بازگشت اب بھی بعض حلقوں سے آرہی ہے ان اشعار سے متعلق ہے جن کو متوارد یا مسروقہ یا ماخوذ بتایا جاتا ہے یا جو ترجمے کے ذیل میں آجاتے ہیں۔ مرزا کے ایسے اشعار کا جائزہ لینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ اس پہلو سے بھی ان کے کلام کی حقیقت کھل جائے اور وہ نہ تو بیجا الزام پر سرزنش کا شکار ہوں اور نہ کسی ایسی جدت کے لیے قابلِ ستایش گردانے جائیں جو ان کے حصے میں نہ آئی تھی یا جس کا انہوں نے کسی رنگ میں ثبوت نہیں دیا ہے۔

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ شاعری کسی زمانے میں توارد سے بچ نہیں سکتی۔ اردو اور فارسی کی شاعری جیسی مرزا کے عہد تک تھی اس میں ترجمہ یا توارد یا جو کچھ اسے نام دیجیے ناگزیر تھا۔ توارد کے متعلق خود مرزا کی کیا رائے تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے حضرت امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں:— "توارد کے متعلق مرزا صاحب کی رائے یہ تھی کہ اگر پس رو شاعر اپنے پیش رو سے

---

[1] "جائزۂ کلام غالب" کا یہ حصہ جو یہاں سے شروع ہوتا ہے آج سے برسوں پہلے رسالہ "زمانہ" کانپور، "ادبِ لطیف" لاہور اور رسالہ "محقق" بہاولپور وغیرہ میں بعنوان "مرزا غالب اور دیگر شعرا" باقساط شائع ہوا تھا۔ موجودہ صورت میں اسے بہت کچھ تغیر و تبدل اور اضافوں کے ساتھ از سرِ نو ترتیب دیا گیا ہے۔

مضمون آفرینی یا طرزِ ادا میں زیادہ لطف و خوبی پیدا کر دے تو یہ اس کے لیئے قابلِ فخر بات ہے۔ مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں۔ ایک مصرع میں تم کو محمد اسحٰق شوکت بخاری سے توارد ہوا، یہ بھی محلِ فخر و شرف ہے کہ جہاں شوکت پہنچا وہاں تم پہنچے۔ وہ مصرع یہ ہے ـــــ چاک گردیدم و از جیب بداماں رفتم۔ پہلا مصرع تمہارا اگر اس کے پہلے مصرعے سے اچھا ہوتا تو میرا دل اور زیادہ خوش ہوتا۔ خود مرزا صاحب پر کسی نے یہ اعتراض کیا تھا کہ آپ کو فلاں شاعر سے توارد ہوا ہے۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:-

ہزار معنیٔ سرجوش خاص نطقِ منست	کہ اہلِ ذوق دل و گوے از عسل بردست
ز رفتگاں بیکے گر توارد م رو داد	ملاں کہ خوبیٔ آرایشِ غزل بردست
مراست ننگ ولے فخر اوست کاں بسخن	بہ سعیٔ فکرِ رسا جا ابداں محل بردست
مبر گمانِ توارد، یقیں شناس کہ دزد	متاعِ من ز نہانخانۂ ازل بردست

اس قطعہ کی تہ میں بھی وہی خیال پنہاں ہے جس کا اوپر کے خط میں ذکر کیا گیا ہے گو معترض کو جلانے کے لیے بات الٹ دی ہے'' [۱]

حضرت عرشی نے اس قطعہ کی تہ میں جس خیال کے پنہاں ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے وہ درست سہی لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ مرزا کا مطلب اس سے کچھ زیادہ ہے۔ ان چار اشعار میں انہوں نے چار باتیں بیان کی ہیں۔ اوّل یہ کہ ان کے بلند پایہ کلام نے اہلِ ذوق کا دل چھین لیا ہے اور وہ شہد سے بھی زیادہ شیریں ہے۔ دوسری بات یہ کہ اگر کسی کے ساتھ انہیں توارد ہو گیا ہے تو اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ان کی غزل کا حسن وہ اڑا لے گیا۔ تیسری یہ کہ اگر کسی کا ان سے توارد ہو گیا تو یہ بات ان کے لیئے باعثِ ننگ تو ہے لیکن اس شخص کے لیئے باعثِ فخر ہے کیونکہ وہ اپنی فکرِ رسا کی بدولت اس مقام تک پہنچ گیا جہاں تک ان کی رسائی ہوئی ہے اور چوتھی بات یہ کہ توارد کا گمان نہ کرنا چاہیئے بلکہ جاننا چاہیئے کہ سخن دزدان کا مال خزانۂ ازل سے چرا لے گیا ہے۔

ان چار نکتوں میں آخری نکتہ قابلِ توجہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ متقدمین کے وہ مضامین جو مرزا کے کلام میں پائے جاتے ہیں دراصل ازل میں انہیں کے حصے میں آئے تھے

---

[۱] ''دیوانِ غالب اردو'' نسخۂ عرشی۔ ۱۹۵۸ء صفحہ ۳۳-۳۴۔

لیکن پیشتر اس کے کہ وہ اشعار میں باندھتے ان کے پیشرو نہاں خانۂ ازل سے چرا لے گئے۔ گویا متقدمین یا ان کے پیشرو ہی سرقہ کے مرتکب ہیں۔ ظاہر ہے کہ مرزا نے سرقہ کے الزام سے بچنے کے لیے یہ عجیب دلیل جو پیش کی ہے نہ صرف یہ کہ قابلِ قبول نہیں بلکہ بعید مضحکہ خیز ہے۔ مرزا کی جدت پسندی اور بے پناہ قوتِ تخلیق کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اپنے قصرِ شاعری کی بنا ڈالنے یا اس کو پروان چڑھانے میں اوروں کے دست نگر رہے ہیں۔ باوجود اس کے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان کے اشعار کہیں کہیں بزبانِ حال اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ وہ بلاواسطہ یا بالواسطہ فارسی دار دو کے بعض پیشرو شعراء اور معاصرین سے خوشہ چینی اور استفادہ کرنے میں بے نیاز نہیں رہے مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ وہ کسی کے مقلد تھے کیونکہ انہوں نے اس قسم کے اشعار میں کسی اور سے استفادہ کرتے ہوئے بھی اپنی ہمہ گیر شخصیت کا رنگ اس طرح بھر دیا ہے اور اپنے ذہنی اور نفسی نقوش کی ایسی چھاپ لگائی ہے کہ ہر شعر ایک دل کو موہ لینے والے پیکر کی صورت میں نظر آتا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں ان پر سرقہ کا الزام عاید کرنا واجب نہیں۔ ہاں اس امر سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے یہاں بعض ایسے اشعار بھی پائے جاتے ہیں جن کا مضمون انہوں نے اوروں سے اخذ کیا ہے مگر وہ اس کو بلند کرنے یا ترقی دینے سے قاصر رہے ہیں، اگرچہ ایسے اشعار کی تعداد مقابلۃً کم ہے۔ اس ذیل میں اس قسم کے اشعار بھی آجاتے ہیں جو اوروں کے اشعار سے ملتے جلتے ہیں مگر اخذ و اثر سے مبرا ہیں۔ عجب نہیں کہ مرزا کے انتہا پسند مداح جن کو ان کے کلام میں کوئی عیب نظر نہیں آتا اور ان کے شدید مخالف جو ان کی بلند پایہ شاعری کے قائل ہی نہیں دونوں ہمارے اس بے لاگ اظہارِ خیال پر چیں بر جبیں ہوں۔ بہر حال یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کسی حق پسند کے لیے آنکھیں موند لینا ممکن نہیں۔

اوروں کے کلام سے مماثل و ہم رنگ اشعار کا ایک حصہ تو وہ ہے جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ اس کا دوسرا حصہ وہ ہے جس سے اردو کے شعرائے مابعد و ان کے بعض معاصرین نے ان سے استفادہ کیا ہے یا دیدہ و دانستہ مضمون اڑا

لیا ہے یا ان کے کسی خیال کو پہلو بدل کر بیان کیا ہے یا دوسرے الفاظ کا لباس پہنا کر پیش کیا ہے۔ یہاں ہم ہر دو قسم کے اشعار زیر عنوان (الف) و (ب) قارئین کے سامنے رکھ کر ان کے لیئے دلچسپی کا سامان فراہم کرنے کی کوشش کریں گے۔ لیجیئے ملاحظہ فرمایئے۔

(حصّۂ الف)

مولانا رومؒ کی مشہور مثنوی کے ابتدائی دو شعر ہیں ؎

بشنو از نے چوں حکایت میکند　　　　از جدائی ہا شکایت میکند

کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند　　　　از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

"دیوانِ غالب" کی پہلی غزل کا مطلع جس کو بعض شارحین کی رائے میں لوگوں نے بے معنی قرار دیا ہے اور بعضوں نے مختلف معنوں پر مشتمل ٹھہرایا ہے کسی حد تک ان دو شعروں کے مفہوم کا ترجمان بتایا جاتا ہے ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا　　　　کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

ایک شارح کے نزدیک مولانا روم کے خیال کی تصویر رنگ درد غم کے ساتھ کھینچی گئی ہے اور مرزا نے اسے صفائی اور خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے لیکن ہماری رائے میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ مولانا روم کے اشعار میں سوز و گداز کے علاوہ نے کی زبانی مبدءِ حقیقی سے جدا ہونے کا واقعہ جس دلنشیں پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے اس نے معنی خیزی کا ایک ایسا دریا بہا دیا ہے کہ اس کا تموّج وجد آفریں ہے۔ بخلاف اس کے مرزا کے شعر میں کسی قدر گنجلک ہے۔ مطلع میں قافیہ کی مجبوری سے ہستیٔ بے اعتبار کی جگہ شوخیٔ تحریر کہدیا۔ الفاظ سے اگرچہ اتنا تو ظاہر ہوتا ہے کہ ہستی (خواہ وہ اعتباری ہی کیوں نہ ہو) بے ثبات بھی ہے اور موجب رنج و ملال و آزار بھی۔ شعر مولانا روم کے مضمون کا مفہوم پورے طور پر ادا کرنے سے قاصر ہے۔

ملا محمد طاہر غنی کاشمیری کا شعر ہے ؎ بسکہ در دشتِ جنوں داریم آتش زیر پا

حلقۂ زنجیر خواہد شعلۂ جوالہ شد

مرزا کہتے ہیں ؂ بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا

موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

اس لحاظ سے کہ غنی وحشت جنوں میں آتش زیر پا ہیں اور وہ حلقۂ زنجیر کو شعلۂ جوالہ سے تشبیہ دیتے ہیں اور مرزا اسیری میں آتش زیر پا ہیں اور حلقۂ زنجیر کو موئے آتش دیدہ قرار دیتے ہیں اگرچہ ان دو شعروں کے معنوی پہلو میں یک گونہ فرق ہے لیکن گمان غالب ہے کہ مجموعی مماثلت کے پیش نظر غنی کے مضمون سے متاثر ہو کر مرزا کا ذہن یہ شعر کہنے کی طرف منتقل ہوا ہو۔

میر کہہ گئے ہیں ؂ قصدِ طریقِ عشق کیا سب نے بعدِ قیس ۔ لیکن ہوا نہ ایک بھی اُس رہ نورد سا

مرزا نے بھی یہ مضمون کسی قدر مختلف اندازِ بیان اختیار کر کے یوں باندھا ہے ؂

جُز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار صحرا مگر بہ تنگیٔ چشمِ حسود تھا

دونوں شعروں کا مطلب یہ ہے کہ قیس کے سوا کوئی اور عاشقِ کامل پیدا نہ ہوا۔

عُرفی کا شعر ہے ؂ عشق مے خوانم و مے گریم زار طفلِ نادانم و اوّل سبق است

اس کے ساتھ مرزا کا یہ شعر دیکھیے ؂ پڑھتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز

لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

دونوں شعر بجائے خود خوب ہیں لیکن مرزا کا شعر عُرفی کے شعر کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

مولانا روم کا ایک اور شعر دیکھیے ؂ مرحبا اے عشقِ خوش سودائے ما

اے طبیبِ جملہ علّت ہائے ما

اس کے ساتھ مُلّا ظہوری کا شعر ملاحظہ ہو ؂ شد طبیبِ ما محبّت منّتش بر جانِ ما

محنتِ ما، راحتِ ما، دردِ ما، درمانِ ما

مرزا نے بھی یہ مضمون ادا کرنے کی یوں کوشش کی ہے ؂

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا

جیسا کہ حضرت اثر لکھنوی مرحوم فرماتے ہیں ۔ عشق درد بھی ہے اور درمانِ درد بھی۔ عشق کی یہ خصوصیت مولانا روم اور ظہوری کے شعروں میں موجود ہے مگر مرزا کے یہاں مفقود۔ انہوں نے

عشق کو دردِ بے دوا کہہ کر جذبۂ عشق کی کیف آفرینی اور سرشاری سے اپنی بے خبری کا ثبوت دیا ہے

ظہوری کا مطلع مولانائے روم کے مطلع سے پست ہے اور مرزا کا اس سے بھی پست تر۔[1]

مرزا سودا کے ایک ہمعصر نوجوان کا شعر ہے ؎ دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

میر کہتے ہیں ؎ عشق کی سوزش نے دل میں کچھ نہ چھوڑا کیا کہیں

لگ اٹھی یہ آگ ناگاہی کہ سب گھر پھک گیا

خواجہ آتش نے یہ مضمون یوں باندھا ہے ؎ جلا دل آتش دردِ جگر سے

لگی ہے آگ یہ اپنے ہی گھر سے

مرزا کے ذہن میں ان اشعار کی کیفیت سمائی ہوئی معلوم ہوتی ہے چنانچہ یہی رنگ ان کے اس شعر سے ٹپکتا ہے ؎

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

نوجوان کا شعر بہت زوردار ہے۔ آتش نے اختصار سے کام لیا ہے۔ میر اور مرزا کے شعروں کا مضمون بالکل یکساں ہے مگر میر کا شعر بہتر ہے۔

بیدل کا ایک شعر ہے ؎ نہ چو عنقا بے نیازِ عرضِ ایجادیم ما

یعنی آں سوئے عدم یک عالم آبادیم ما

مرزا کے مندرجۂ ذیل شعر کی بنیاد غالباً بیدل کا یہی مطلع ہے ؎

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

مرزا نے عنقا کو عدم میں رکھ کر اور اپنے آپ کو اس سے بلند تر مقام پر ظاہر کر کے مضمون کو ترقی دی ہے

فارسی میں کسی کا شعر ہے ؎ بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل

ہر کہ از بزمِ تو برخاست پریشاں برخاست

مرزا نے دوسرے مصرعے کا ترجمہ کر کے شعر کو یوں اردو کی شکل دے دی ہے ؎

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

---

[1] "مطالعۂ غالب" از نواب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی مرحوم ص ۳۴ ۔ ۳۵ ۔

میر کا یہ شعر دیکھئے ؎

جگر ہی میں یک قطرہ خوں ہے سرشک
پلک تک گیا تو تلاطم کیا

مرزا اس مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں ؎

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالبؔ
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

فارسی کا ایک شعر ہے ؎

نازنیں را عشق ورزیدن نہ زیبد جانِ من
شیر مردانِ بلاکش پا دریں غوغا نہند

مرزا کے یہاں بھی یہ مضمون پایا جاتا ہے ؎

دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

میر کا شعر ہے ؎

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دم کے جانے کا نہایت غم رہا

اور مرزا کہتے ہیں ؎

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

ان دونوں شعروں کے مطلب میں کوئی نمایاں فرق نہیں لیکن میر کا شعر زیادہ سلیس اور سلجھا ہوا ہے۔
میر کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو ؎

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

اس کو مدنظر رکھتے ہوئے مرزا کا یہ شعر دیکھئے ؎

احباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

استاد ذوقؔ کا ایک شعر ہے ؎

کہتے ہیں آج ذوقؔ جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

مرزا کے یہاں بھی یہ مضمون اسی رنگ میں ہے ؎

یہ لاشِ بے کفن اسدِؔ خستہ جاں کی ہے — حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ذوقؔ کا مقطع بہتر ہے۔

مرزا بیدلؔ کا شعر ہے ؎

بر دلِ مایوس بیدلؔ پشت دستے میگزم — غنچۂ ایں عقدہ کاش از سعیٔ دنداں بشگفد

مرزا کا مندرجۂ ذیل شعر بیدلؔ کے اس شعر سے پرتو پذیر دکھائی دیتا ہے ؎

بہ فیضِ بے دلی نومیدیٔ جاوید آساں ہے — کشاکش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

شیخ سعدیؔ کا مشہور شعر ہے ؎

یا وفا خود نہ بود در عالم — یا مگر کس دریں زمانہ نہ کرد

مرزا کہتے ہیں ؎

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا — ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

اس مضمون پر مومنؔ کا شعر بھی دیکھیے ؎

کس سے نباہیے کہ سوائے وفات کے — دنیا میں ہائے نام وفا کا نہیں رہا

مرزا کی اس غزل کا ایک اور شعر ہے ؎

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

یہ مضمون خفیف سے تغیر کے ساتھ ذوقؔ کے یہاں موجود ہے ؎

کہتے ہیں مر جائیں گر چھُوٹ جائیں غم کے ہاتھ سے
پر ترے غم سے ہمیں مرنے کی فرصت بھی نہیں

ناصر علی سرہندی کا شعر ہے ؎

نیارد چشمِ بیدل تابِ حسنِ بے حجابش را — کہ باشد صافیٔ آئینہ شبنم آفتابش را

مرزا کا مندرجۂ ذیل شعر نزاکتِ خیال اور طرزِ ادا میں ناصر علی کے اس شعر سے بہت قریب ہے ؎

کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے — کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

نعمت خاں عالیؔ کا ایک شعر ہے ؎

جاروب نفسم آمد و رفت از پئے کشتن — ہر لحظہ بمن مے کشد ایں تیغ دو دم را

اور صہبائی کہتے ہیں ؎

چوں شرر حاصلِ ما در گروِ دستِ فناست — برق بار یشہ کند سر بدر از دانۂ ما

ان دو شعروں کو سامنے رکھ کر اب مرزا کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی — ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

تینوں شعروں میں بنیادی خیال ایک ہے یعنی وجود خود فنا کی دلیل ہے۔

میرؔ کا ایک اور شعر ہے ؎

نہ ہو کیوں غیرتِ گلزار وہ کوچہ خدا جانے — لہو اس خاک پر کن کن عزیزوں کا گرا ہوگا

مرزا کہتے ہیں ؎

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا — قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

مرزا نے پہلو بدل کر مضمون کو مختلف رنگ میں پیش کیا ہے مگر شعر میرؔ کے انداز و اثر سے بے نیاز نہیں۔

ذوقؔ کا شعر ہے ؎

میں ہوں وہ رہ نوردِ شوق میرے ساتھ جاتا ہے

بہ رنگِ سایۂ مرغِ ہوا نقشِ قدم میرا

مرزا کہتے ہیں ؎

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا — حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

دونوں استادوں کا مضمون ایک ہے۔ ذوقؔ نے نقشِ قدم کو مرغِ ہوا کا سایہ بتایا ہے اور مرزا نے اسے موجۂ رفتار کا حباب قرار دیا ہے۔ دونوں تشبیہیں نہایت عمدہ ہیں۔ ذوقؔ کے شعر میں سلاست وصفائی زیادہ ہے۔ قائمؔ چاند پوری کا شعر ہے ؎

وہ دن گئے کہ اٹھاتا تھا بارِ نکہتِ گل — ہے بے دماغیٔ دل ان دنوں گراں مجھ کو

مرزا کا ہم مضمون شعر دیکھیے ؎

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے — کہ بوئے موجِ گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

بقول پروفیسر مجنوں گورکھپوری قائمؔ کے شعر کے مقابلہ میں یہ محض شاعرانہ مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ

مضمون کبھی ذوقؔ مرحوم نے مختصر الفاظ میں نئے ڈھنگ سے باندھا ہے ؎

ہے نکہتِ ریحاں کا دماغ اب کسے تجھ بن　　　آتا ہے مرا ناک میں دم اور زیادہ

ناصر علی سرہندی کا ایک اور شعر ہے ؎

تو چوں ساقی خنوی در دِ تنگ ظرفی نمے ماند　　　بقدرِ بحر باشد وسعتِ آغوشِ ساحل ہا

مرزا اس مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں ؎

بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی　　　جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

جیسا کہ حضرت اثرؔ لکھنوی فرماتے ہیں ۔ عجب نہیں مرزا نے اپنے شعر کا مضمون علی سرہندی کے شعر سے اخذ کیا ہو۔

شیخ سعدیؔ کا شعر ہے ؎

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار　　　ہر ورقے دفتریست زمعرفتِ کردگار

عرفیؔ نے یہ مضمون اپنے خاص انداز میں یوں ادا کیا ہے ؎

ہر کس نہ شناسندۂ راز است وگرنہ　　　ایں ہا ہمہ راز است کہ معلومِ عوام است

مرزا کا مندرجۂ ذیل شعر اسی شعر سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا　　　یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

یہ مضمون ذوقؔ کے ہاں بھی پایا جاتا ہے ؎

نہیں گوشِ شنوا باغِ جہاں میں غافل　　　ورنہ ہر برگ ہے یاں نغمہ سرائی کرتا

مرزا ؎

صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا وگرنہ میں　　　طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

یہ مضمون ایک ہندی شاعر کے یہاں زیادہ اچھی طرح سے بندھا ہے ؎

آہ کروں تو جگ جلے اور جنگل بھی جل جائے　　　پاپی جیورا نا جلے جس میں آہ سمائے

ہندی شاعر کہتا ہے کہ اس کی آہ سے ایک زمانہ جل جائے مگر وہ ایسا کم نصیب اور سخت جان ہے، کہ اس کا دل جس میں اس آہ کا مقام ہے وہ نہ جلے گا۔ بخلاف اس کے مرزا کہتے ہیں کہ وہ ضبطِ آہ سے فائدہ اٹھا رہے ہیں ورنہ ایک ہی آہ کریں تو جل جائیں ۔

مومنؔ کا ایک شعر ہے ؎

وقتِ جوشِ چشمِ گریہ میں جو گرمِ نالہ تھا — حلقۂ گرداب رشکِ شعلۂ جوالہ تھا

مرزا نے یہ مضمون یوں کہا ہے ؎

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا — شعلۂ جوالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا

مومن کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ اس کے دریائے اشک کا بھنور نالوں کی شرر فشانی سے چکر کھانے والے شعلے کو مات کرنے لگا اور مرزا کے شعر کا مفہوم یہ کہ شبِ غم میں ان کے سوزِ دل کی تاثیر سے بادل کا پتّا پانی بن گیا اور اس پانی میں جو بھنور پڑا چکر کھانے والا شعلہ نظر آنے لگا۔ بنیادی طور پر دونوں شعروں کا مضمون ایک ہے۔ انداز بیاں میں خفیف تفاوت کے باوجود مماثلت بالکل عیاں ہے۔

فارسی کے مشہور شاعر خواجوے کرمانی نے ایک غزل میں اپنی اور محبوب کی حالت کا مقابلہ دو شعروں میں اس طرح کیا ہے ؎

من افتادہ و سر بر روئے خارِ تکیہ زدہ — تو سر نہادہ و بر فرشِ پرنیاں خفتہ
مرا دو دیدہ پر آبِ خوں فشاں بیدار — ترا دو نرگسِ مخمور و ناتواں خفتہ

مرزا نے بھی بالکل اسی انداز مگر مختلف تشبیہات و استعارات کے پردے میں شبِ غم کے واقعات و مناظر بیان کرتے ہوئے اپنی اور محبوب کی حالت کا مقابلہ کیا ہے۔ اس غزل کے بھی دو شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبِ جو — یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا
یاں سرِ پرشور بے خوابی سے تھا دیوار جو — واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا

ملا وارستہ (امام بیگ) کا شعر ہے ؎

آنچہ می جستیم کم دیدیم در کار است و نیست — در حقیقت نیست جز انساں کہ بسیار است و نیست

مرزا نے یہ مضمون یوں کہا ہے ؎

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا — آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

میر کا شعر ہے ؎

آج پھر واں بے حمیت میر تھا — کل لڑائی سی لڑائی ہو چکی

مرزا کہتے ہیں ؎

وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھ کو | آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

شیخ ذوق کا شعر ہے ؎

ہلال کو دیکھیں کیوں فلک پر اگر ہے منظور عید ہم کو
تو اس کی تیغِ ستم کے دل میں لبِ جراحت نہ دیکھ لیں گے

مضمون کے اعتبار سے مرزا کا مندرجۂ ذیل شعر اس سے بہت قریب ہے ؎

عشرتِ قتلگہِ اہلِ تمنّا مت پوچھ | عیدِ نظّارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

خواجہ حافظ کا شعر ہے ؎

آفریں بر دلِ نرم تو کہ از بہرِ ثواب | کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدۂ

میر کہتے ہیں ؎

بعد مرنے کے مری قبر پہ آیا وہ میر | یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد

مرزا نے یہ مضمون یوں باندھا ہے ؎

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ | ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

تینوں شاعروں کا طنزیہ اندازِ بیاں لطف سے خالی نہیں ۔ میر کا شعر بجائے خود ایک نشتر ہے لیکن مرزا نے بھی اپنی خاص طرزِ ادا سے مضمون میں ایک نئی روح پھونک دی ہے ۔ یہ مضمون مومن نے بھی خوب باندھا ہے ؎

کر کے زخمی مجھے نادم ہوں یہ ممکن ہی نہیں | گر وہ ہوں گے بھی تو بے وقت پشیماں ہوں گے

مرزا نے "زود پشیماں" کے الفاظ سے شعر کو نہایت پُر اثر بنا دیا ہے اور مومن نے "بے وقت" کہہ کر اپنے شعر کو بلیغ کر دیا ہے ۔ ناطق مکرانی کا شعر ہے ؎

لذّتِ زخم بسکہ دلِ زارِ من گرفت | ناخن زدم بہ سینہ اگر بہ شدن گرفت

مرزا نے اسی مضمون سے ایک اور بات پیدا کر دی ہے ؎

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا | زخم کے بھرتے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

ناطق لذّتِ درد سے محروم نہ رہنے کی خاطر زخموں کے مندمل ہونے پر انہیں ناخنوں سے چھیل کر پھر تازہ کرنا چاہتے ہیں ۔ مرزا کہتے ہیں کہ اگر زخم تازہ کرنے سے باز رکھنے کے لیے ان کے ناخن کاٹ دیے جائیں گے

تو اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا کیونکہ جب تک پرانے زخم بھر جائیں گے ان کے ناخن بھی بڑھ جائیں گے۔
مومن کا یہ شعر دیکھیے ؎

ہائے رے چھیڑ رات سُن سُن کے　　حال میرا کہا کہ کیا صاحب

اس کے ساتھ مرزا کا یہ شعر دیکھیے ؎

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک　　ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

دونوں شاعر محبوب سے تجاہلِ عارفانہ منسوب کرتے ہیں۔ مومن کا مطلب یہ ہے کہ اس کا حال سننے کے باوجود محبوب کی بے توجہی محض چھیڑ کی غرض سے ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ محبوب حالِ دل متوجہ ہو کر نہیں سنتا اور اس کی بے توجہی حد سے گزر گئی۔ مرزا کا ایک اور شعر بھی اسی رنگ میں ہے ؎

تجاہل پیشگی سے مدعا کیا　　کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا

عرفی کا ایک شعر ہے ؎

منم آں سیر زجاں گشتہ کہ با تیغ و کفن　　تا درِ خانۂ جلاّد غزل خواں رفتم

میر نے یہ مضمون یوں کہا ہے ؎

مشتاقِ مرگ کون ہے مجھ سا جہان میں　　باندھے ہوئے میں سر پہ ہمیشہ کفن رہا

اور مرزا اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں　　عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

عرفی کہتا ہے۔ میں زندگی سے بیزار ہو چکا تھا اس لیے قتل ہونا چاہتا تھا مگر محبوب ہی کے ہاتھ سے۔ اس خوشی میں غزل گنگناتے ہوئے خود ہی تیغ و کفن لے کر اس کے ہاں گیا تاکہ وہ مجھے قتل کرے۔ مرزا کا شعر عرفی کے شعر سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ وہ بھی محبوب کے ہاتھوں قتل ہونا چاہتے ہیں لیکن اس کے ہاں تیغ و کفن باندھے ہوئے اس لیے جاتے ہیں کہ اسے ان کو قتل کرنے میں کوئی عذر نہ رہے۔ حضرت وجاہت علی سندیلوی نے اپنی تصنیف "نشاطِ غالب" میں ان دو شعروں کا موازنہ کرتے ہوئے طویل بحث چھیڑ دی ہے اور جملہ شارحین کے خلاف "سیر زجاں گشتہ" کو مختلف معنی پہنا کر یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ عرفی نے اپنا مطلب اپنے اندازِ بیان سے یقیناً حدِ کمال کو پہنچا دیا ہے ان کا یہ فرمانا مبالغہ سے خالی نہیں کہ مرزا نے عرفی کے مضمون پر طبع آزمائی کی تو ایسی کہ خود عرفی کے لیے "باعثِ رشک بن گئے"۔ عرفی کے شعر میں

"غزل‌خواں رفتم" کا ٹکڑا داد سے مستغنی ہے۔ مرزا کے شعر میں کوئی ایسی بات نہیں۔ یہ مضمون مومن نے بھی خوب باندھا ہے ؎

اے تند خو آ جا کہیں تیغ کمر سے باندھ کر　　　　کن مدتوں سے ہم کفن پھرتے ہیں سر سے باندھ کر

اس سلسلے میں حضرت معجز سہسوانی کا بیان جو انہوں نے غالب و مومن کے اشعار کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے قابلِ غور ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "تیغ باندھنا سپہگری کی شان ہے نہ کہ عاشق کی۔ معشوق کے لیے تیغ کا لیجانا درست ہے لیکن تیغ باندھ کر اس کے سامنے جانا دوسری بات ہے۔ غرضکہ کلام مقتضائے حال کے مناسب نہیں اور پھر اس کا ماخذ عرفی کا شعر ہے۔ مومن نے تیغ قاتل کی کمر میں اور کفن اپنے سر باندھا ہے اور یہ تخیل عرفی کے خیال سے بھی بالکل علیحدہ ہے۔ لہٰذا مومن کا شعر ہر عیب سے پاک ہے۔" میر کا شعر عرفی، مرزا اور مومن کے اشعار کے مقابلے میں بہت پست ہے۔

نصیرا ہمدانی کا شعر ہے ؎

مُردم ز شوق وعدہ بفردا چہ می دہی　　　　فردائے ناتوانِ تو فردائے دیگر است

اس کے ساتھ شاہدی کا یہ شعر دیکھئے ؎

وعدۂ وصل بفردا دہی و می دانی　　　　ہر کہ امروز ترا دید بہ فردا نرسد

اب قاسم بیگ حالتی کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

از تو وفائے وعدہ نباشد ہوس مرا　　　　شادی وعدہ ہائے وفائے تو بس مرا

اس کے بعد میلی ہروی کا شعر دیکھیے ؎

بیم از وفا مدار بدہ وعدۂ کہ من　　　　از ذوقِ وعدۂ تو بہ فردا نمی رسم [۱]

مرزا کہتے ہیں ؎

ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

نصیرا شوق کے مارے مرا جاتا ہے۔ محبوب کے وعدۂ فردا کا انتظار کرنا اس کے

---

[۱] "شرح دیوانِ غالب" از نظامی بدایونی میں یہ شعر میر عبداللہ پیامی سے منسوب کیا گیا ہے۔

بس کی بات نہیں۔ شاہدی کے نزدیک محبوب وعدۂ وصل کل پر اسلئے ملتوی کرتا ہے کہ اسے معلوم ہے کہ جس نے اُسے آج دیکھ لیا کل تک زندہ نہیں رہے گا۔ حالیؔ محبوب سے وعدۂ وصل چاہتا ہے۔ وہ اس کے وفا کئے جانے کی ہوس نہیں رکھتا کیونکہ اس کے نزدیک وعدہ سے جو خوشی حاصل ہوگی اس کے لئے کافی ہے۔ تسلیؔ کہتا ہے کہ وہ وعدۂ وصل کی خوشی میں زندہ ہی نہ رہے گا۔ اس لئے محبوب سے کہتا ہے کہ وہ ایفائے وعدہ کا خیال ہی نہ کرے۔ غرض اس سے یہ ہے کہ محبوب وعدہ کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ مرزا وعدے کو سچا نہیں سمجھتے کیونکہ اگر انہوں نے یہ سچا سمجھا ہوتا تو وہ خوشی کے مارے مر چکے ہوتے۔

یہاں بھی سندیلوی صاحب کئی شارحوں کے بیان سے بحث کرنے کے بعد تسلیؔ اور مرزاؔ کے شعروں کا موازنہ کرتے ہوئے یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ دونوں میں بالکل جداگانہ بات کہی گئی ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں حقیقت یہ ہے کہ محولۂ بالا تمام اشعار بظاہر مختلف مضمون کے حامل ہونے کے باوجود ایک ہی بنیادی خیال کی ارتقائی صورت پیش کرتے ہیں۔ صرف اندازِ بیان کے پہلو بدلے گئے ہیں اور پس منظر مختلف ہونے کی بنا پر انہوں نے جداگانہ صورت اختیار کی ہے جو قابلِ دید ہے۔ بنیادی مضمون میں مماثلت ظاہر ہے۔ اس سلسلے میں مومنؔ کا یہ شعر بھی قابلِ مطالعہ ہے ؎

کیوں کر امیدِ وفا سے ہو تسلّی دل کو　　فکر یہ ہے کہ وہ وعدے سے پشیماں ہوگا

مرزا کہتے ہیں کہ انہیں وعدۂ محبوب پر اعتبار ہی نہیں اور اس لئے زندہ رہے ورنہ شادی مرگ ہوئے ہوتے۔ مومنؔ کہتا ہے کہ محبوب تو وعدہ کر چکا ہے مگر اسے ڈر ہے کہ وعدہ کرنے پر اب اس کو شرمندگی ہوگی اور وعدہ وفا نہ کرے گا۔ اس بات سے فکر اور پریشانی پیدا ہوئی ہے۔ مومنؔ کا یہ شعر ہم مضمون نہیں لیکن بجائے خود خوب ہے۔ ایفائے وعدہ پر مومنؔ کا ایک اور شعر پیشِ نظر کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ؎

ہم جان فدا کرتے گر وعدہ وفا ہوتا　　مرنا ہی مقدر تھا وہ آتے تو کیا ہوتا

یعنی اگر معشوق وعدہ وفا بھی کرتا تب بھی خوشی کے مارے جان دے دیتے۔ غرض ہجر ہو یا وصل جان دینا بہر حال قسمت میں ہے۔

فارسی میں کسی اُستاد کا شعر ہے ؎

غرقۂ بحریم مارا در دیارِ ما مپرس　　　لقمۂ کامِ نہنگیم از مزارِ ما مپرس

مرزا فرماتے ہیں ؎

ہوئے مر کے ہم جو رُسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا　　　نہ کہیں جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

فارسی شاعر کہتا ہے ۔ ہم غرقِ دریا اور دہانِ نہنگ کا لقمہ ہیں ۔ ہمارے مزار کا نشان ڈھونڈھنا عبث ہے ۔ مرزا کہتے ہیں ۔ ہم غرقِ دریا ہوئے ہوتے تو مزار کا نام و نشان باقی نہ رہتا اور مر کے رُسوا نہ ہوتے ۔

مومن کا شعر ہے ؎

ہوش میں آ، مجھ میں جان نہیں　　　غفلتِ جرأت آزما کب تک

مرزا کہتے ہیں ؎

نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں　　　تغافل ہائے تمکیں آزما کیا

ان دو شعروں کے دوسرے مصرعے کا مضمون واحد ہے یعنی عاشق کے صبر و تحمّل کی آزمائش کے لیے محبوب کے تغافل اختیار کرنے کی شکایت ۔ مومن کہتا ہے کہ اس میں جان نہیں ۔ اگر معشوق غفلت ہی سے کام لیتا رہا تو وہ جاں بحق ہوگا اس لیئے اس کو خبردار کرتا ہے کہ وہ ہوش میں آئے ۔ ایسا نہ ہو کہ عاشق کی موت کا باعث ہو کر مجرم قرار پائے ۔ شعر بلیغ ہے ۔ مرزا نے مصرعۂ اول میں ۔ بے تکلف نگاہ کی تمنّا ظاہر کر کے شعر میں زور پیدا کیا ہے ۔ اس سے مضمون بلند ہو گیا ہے ۔

مُلا غنیمت کا شعر ہے ؎

زہرش سینہ ہا جولا نگہِ برق　　　دلِ ہر ذرّہ در جوشِ انا الشرق

مرزا کہتے ہیں ؎

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر　　　ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

"غنیمت اور مرزا دونوں کے شعر ہم مضمون ہیں یعنی دونوں نے مسئلۂ وحدت الوجود نظم کیا ہے لیکن معنوی اضافتوں، زور اور جوش و خروش کے ساتھ جو نُدرتِ ادا مُلا غنیمت کے شعر میں ہے غالب کا شعر اس سے یک لخت محروم ہے"[1]

---

[1] "مطالعۂ غالب"، از اثر لکھنوی ۔ ص ۔ ۳۸ ۔ ۴۰ ۔

عرفی کا ایک شعر ہے ؎

وقتِ عرفی خوش کہ بکشودند چوں در بر رخش | بر درِ نکشودہ ساکن شد درِ دیگر نہ زد

مطلب یہ کہ عرفی وہاں گیا اور گھر کا دروازہ بند پایا لیکن وہیں بیٹھا رہا۔ کسی دوسرے دروازے پر جانا مناسب نہ سمجھا۔ مرزا مضمون میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے یوں کہتے ہیں ؎

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم | اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

وہ خودداری کے خیال سے دروازے پر پڑے رہنے کے بجائے واپس ہونا ہی مناسب سمجھتے ہیں۔ اُستاد ذوقؔ کا شعر ہے ؎

دانہ خرمن ہے ہمیں قطرہ ہے دریا ہم کو | آئے ہے جزو میں نظر کل کا تماشا ہم کو

اور مرزا کہتے ہیں ؎

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل | کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

یہ دو شعر بھی ہم مضمون ہیں۔ غبا دل انداز بیان سے مطلب میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ میرؔ کا شعر ہے ؎

کاسۂ چشم لے کے جوں نرگس | ہم نے دیدار کی گدائی کی

خواجہ آتشؔ کہتے ہیں ؎

آنکھیں نہیں ہیں چہرے پہ تیرے فقیر کے | دو ٹھیکرے ہیں بھیک کے دیدار کے لیئے

مرزا فرماتے ہیں ؎

زکوٰۃِ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا | چراغِ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا

اگرچہ میرؔ اور آتشؔ کے شعر مقابلتہً ایک دوسرے کے زیادہ قریب نظر آتے ہیں تینوں شعروں کا مضمون ایک ہے۔ میرؔ کے ہاں اختصار اور سلاست ہے اور مرزا نے شاعرانہ تکلف سے کام لیا ہے۔ مرزا سوداؔ کا ایک شعر ہے ؎

زباں ہے شکر میں قاصر شکستہ بالی کے | کہ جس نے دل سے مٹایا خلش رہائی کا

دیکھئے مرزا کا یہ شعر مفہوم میں سوداؔ کے شعر سے کتنا قریب ہے ؎

تمنائے زباں محوِ سپاسِ بے زبانی ہے | مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بیدستِ وپائی کا

میر کا ایک اور شعر دیکھئے ؎

اب پھر ہمارا اس کا محشر میں ماجرا ہے دیکھیں کہ اس جگہ کیا انصاف داد گر ہے

مرزا اسی مفہوم کو یوں بیان کرتے ہیں ؎

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا

کسی کا احسان اٹھانا برا ہوتا ہے۔ اس مضمون پر بعض شعرائے فارسی و اردو نے مختلف پہلوؤں سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ مرزا مظہر جانِ جاناں کا ایک فارسی شعر ہے ؎

حیف دردے کہ بہ خود ننگِ مداوا بر داشت بہرِ جانے نہ تواں نازِ مسیحا بر داشت

شیخ ناسخ کہتے ہیں ؎

وہ بادل ہیں جو لیں قرض آبِ دریا مروں پیاسا نہ لوں آبِ بقا قرض

مومن فرماتے ہیں ؎

منّتِ حضرتِ عیسےٰ نہ اٹھائیں گے کبھی زندگی کے لیے شرمندۂ احساں ہوں گے

اور ذوق کا شعر ہے ؎

نہ پکڑیں دامنِ الیاس گردابِ بلا میں ہم کہ بدتر ڈوب کر مرنے سے ہے جینا سہارے کا

اب مرزا کا شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

درد منّت کشِ دوا نہ ہوا میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

یعنی اچھا ہوتا تو دوا کا احسان مند ہونا پڑتا۔ یہ سب اشعار ہم مضمون ہیں۔ ہر ایک کا اندازِ بیاں اپنی جگہ خوب ہے۔ مرزا ؎

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

مومن کا مندرجۂ ذیل شعر جو مرزا کے ایک اور شعر کے مقابلے میں اس سے پہلے آچکا ہے برنگِ دیگر اسی مفہوم کا حامل ہے ؎

اے تند خو آجا کہیں تیغہ کمر سے باندھ کر کن مدّتوں سے ہم کفن پھرتے ہیں سر سے باندھ کر

مومن ہی کا شعر ہے ؎

دشنامِ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں اے ہم نفس نزاکتِ آواز دیکھنا

یہ مضمون مرزا نے یوں باندھا ہے ؎

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

دونوں شعروں میں دُشنامِ یار کے مرغوب ہونے کا مضمون ادا کیا گیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ مومنؔ اس کی وجہ معشوق کی نزاکتِ آواز بتاتے ہیں اور مرزا اس کے لبِ شیریں۔ اس کے علاوہ موقع و محل بھی مختلف ہے۔ یہاں بھی مومنؔ کا شعر مقابلتاً اچھا ہے۔

اسی مضمون پر مومنؔ کا ایک اور شعر بھی سُنیئے۔ یہ بھی خوب ہے ؎

لگتی ہیں گالیاں بھی تیرے مُنہ سے کیا بھلی قربان تیرے پھر مجھے کہہ لے اسی طرح

اس سلسلے میں نواب مصطفیٰ خان شیفتہؔ کا یہ بلیغ شعر بھی دیکھئے ؎

دشمن پسِ دُشنام بھی ہے طالبِ بوسہ محوِ اثرِ لذّتِ دُشنام نہ ہوگا

میرؔ کا شعر ہے ؎

تیز یوں ہی نہ تھی شب آتشِ شوق تھی خبر گرم اُن کے آنے کی

مرزا کہتے ہیں ؎

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

یہاں مرزا نے میرؔ کے شعر کا دوسرا مصرع مستعار لیا ہے۔ صرف "تھی" کو "ہے" میں بدل دیا ہے۔ میرؔ کا مصرعۂ اوّل جذبۂ حقیقی کا حامل ہے اور دوسرا حسبِ ضرورت۔ مرزا نے مصرعۂ ثانی میں اپنی بے مائگی کی عامیانہ تشریح سے اسے پستی کا رُخ دکھایا ہے۔

خواجہ حافظؔ کا شعر ہے ؎

جاں دادمش بہ مژدہ و خجلت ہمے برم زیں نقدِ کم عیار کہ کردم نثارِ دوست

آذریؔ طوسی نے یہ مضمون یوں کہا ہے ؎

جانے کہ داشت کرد فدائے تو آذریؔ شرمندہ از تو گشت کہ جانِ دگر نداشت

مرزا نے بھی یہ مضمون اپنی زبان میں یوں کہا ہے ؎

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

بیدلؔ کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

دلِ آسودۂ ما شورِ امکاں در قفس دارد　　　گہر دز دیدہ است اینجا عنانِ موجِ دریارا

یعنی ہمارا دل جس کو تو آسودہ دیکھتا ہے اس میں ایک عالم کا شور سمایا ہوا ہے۔ گویا موتی میں دریا بھر کا اضطراب ہے " (آسی)

مرزا کے مندرجہ ذیل شعر کی بنیاد یہی شعر ہے ؎

بگلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا　　　گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

میر حسن کا ایک شعر ہے ؎

گرچہ ہے دل کو یقیں خط تو نہیں پڑھنے کا وہ　　　پر تقاضا شوق کا لکھنے سے کب رکھتا ہے باز

اسی مضمون کو مرزا کے یہاں دیکھئے ؎

یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب　　　مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

مضمون کے اعتبار سے ان دو شعروں میں کوئی خاص فرق نہیں لیکن مرزا کا اسلوب بیان ایسا ہے کہ اس سے معنی کے کئی پہلو نکلتے ہیں بخلاف میر حسن کے شعر کے کہ اس میں نشستِ الفاظ ایسی ہے کہ معنی محدود ہو گئے ہیں۔

افسردگی و بیزاری کی حالت میں انسان کو گلگشتِ چمن کی ہوس نہیں رہتی۔ یہ مضمون فارسی اور اردو کے کئی شاعروں نے باندھا ہے۔ ابوتراب تراب کا شعر ہے ؎

نکہتِ گل رساند پیغامے　　　بیدماغی نداد ہیچ جواب

میر مومن نے اپنے انداز میں اس مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

بگوش پنبہ نہم از صدائے خندۂ گل　　　دماغ نالۂ بلبل دریں بہار کجاست

نواب عمدۃ الملک امیر خاں انجام نے اس خیال کو زیادہ نکھری ہوئی صورت میں اس طرح پیش کیا ہے ؎

مارا ہوائے گلشن و باغے نماندہ است　　　اے بوئے گل برو کہ دماغے نماندہ است

میر کہتے ہیں ؎

ہمیں تو باغ کی تکلیف سے معاف رکھو　　　کہ سیر و گشت نہیں رسمِ اہلِ ماتم کی

اور سودا فرماتے ہیں ؎

چھیڑ مت بادِ بہاری کہ میں جوں نکہتِ گُل ‏ ‏ پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا

سید انشاء کا مشہور شعر ہے ؎

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی ‏ ‏ تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

اب مرزا کا شعر دیکھیے ؎

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو ‏ ‏ مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

ظاہر ہے کہ یہ مضمون تراب سے مستعار لیا گیا ہے لیکن ہر شاعر نے اپنے اپنے انداز میں اسے بخوبی ادا کیا ہے۔ مرزا نے حالتِ غم میں خندۂ گُل کو خندۂ بیجا قرار دے کر شعر میں زور پیدا کیا ہے۔ سید انشاء کا شعر طرزِ ادا کے لحاظ سے بہترین ہے مُلا نظیری کا شعر ہے ؎

بزیرِ ہر بُنِ مُو چشم روشنیست مرا ‏ ‏ بروشنائیِ ہر ذرّہ روزنیست مرا

مرزا کہتے ہیں ؎

ہنوز محرمیِ حُسن کو ترستا ہوں ‏ ‏ کرے ہے ہر بُنِ مُو کام چشمِ بینا کا

حضرت اثر لکھنوی نے ان دو شعروں کی تشریح کرتے ہوئے ان کا باہمی مقابلہ کیا ہے اور نظیری کے شعر کی دل کھول کے داد دیتے ہوئے مرزا کے شعر کو اس کا جزوی اور ناقص ترجمہ قرار دیا ہے۔ بخلاف اس کے بعض حضرات مرزا کے شعر کو نظیری کے شعر پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان میں حضرت وجاہت علی سندیلوی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں جن کے نزدیک نظیری کا شعر صرف شاعرانہ تعلّی ہے اور غالب کا شعر ترجمانِ حقیقت۔ لیکن نظرِ انصاف سے دیکھا جائے تو دونوں شعر اپنی اپنی جگہ خوب ہیں۔ البتہ یہ کہنا درست ہے کہ دراصل یہ دو شعر متحد المضمون نہیں ہیں جس کی تصدیق حضرت عرشی نے بھی کی ہے[1]۔ نظیری اپنے آپ کو محرمِ حُسن بتاتا ہے اور غالب نامحرمِ حسن۔ نوعیتِ مضمون اور طرزِ ادا میں بہت کچھ فرق ہونے کے باوجود عجب نہیں کہ مرزا کے شعر کا محرک نظیری ہی کا شعر ہو۔ کسی فارسی شاعر نے کہا ہے ؎

صد جور مے کنی و نمے رنجم اے رقیب ‏ ‏ چوں آگہم کہ ایں ہمہ فرمودہ می کنی

مرزا کا شعر ہے ؎

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسد ‏ ‏ جفا میں اس کی ہے انداز کار فرما کا

[1] "نشاطِ غالب" از وجاہت علی سندیلوی۔ ص ۔ ۶۱ ۔ (حاشیہ)

دونوں شعروں میں بتایا گیا ہے کہ محبوب ہی بہر صورت جور و ستم کا باعث ہوتا ہے۔ فارسی شعر میں رقیب کو اس کے لئے آلۂ کار بنایا گیا ہے اور مرزا کو آسمان دیکھ کر محبوب یاد آجاتا ہے کیوں کہ اس کی جفاؤں میں محبوب ہی کا انداز پایا جاتا ہے۔ شیخ علی حزیں کا ایک شعر ہے ؎

چہ شد از توبہ اگر دامنِ خشکے دارم	پیشِ ابرِ کرمِ پیرِ مغاں ایں ہمہ نیست

بیگی دخترِ امیر جلائر (لالہ خاتون) نے اس مضمون کو یوں کہا ہے ؎

من اگر توبہ ز مے کردہ ام اے سروِ سہی	تو خود ایں توبہ نہ کردی کہ مرا مے نہ دہی

مرزا کہتے ہیں ؎

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں	گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

حزیں پیرِ مغاں کے ابرِ کرم کا امیدوار ہے جس کی بدولت توبہ کرنے کے بعد بھی اس کا دامنِ خشک نہیں رہ سکتا یعنی وہ شراب سے بہرہ یاب ہو سکتا ہے۔ بیگی کہتی ہے کہ اگر اس نے شراب سے توبہ کی تھی تو یہ اس کو شراب سے محروم رکھنے کی کوئی وجہ نہ تھی کیوں کہ ساقی نے تو توبہ نہیں کی تھی۔ مرزا تعجب کا اظہار کرتے ہیں کہ انہیں شراب کیوں نہ ملی۔ مانا انہوں نے توبہ کی تھی۔ ساقی نے خود کیوں نہ پلادی۔ وہ اپنے فرض سے کیوں غافل رہا۔ تینوں شعروں کا بنیادی خیال ایک ہے۔ صرف اندازِ بیان مختلف ہے معنی کے اعتبار سے مرزا کا شعر بیگی کے شعر سے بہت قریب ہے البتہ بیگی کے شعر میں "سروِ سہی" کے الفاظ بے محل واقع ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں اس کا اندازِ بیان بالکل سیدھا سادا ہے۔ مرزا کا شعر مقابلۃً وسیع المعانی ہے اور طرزِ ادا میں واقعی ان کی قادر الکلامی کا آئینہ دار۔

خواجہ آتش کا شعر ہے ؎

مشتاقِ دردِ عشق جگر بھی ہے دل بھی ہے	کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ

یہ مضمون برنگِ دیگر مرزا کے ہاں یوں جلوہ گر ہے ؎

وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا	ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں

حکیم ہمام کا شعر ہے ؎

درمیانِ من و دلدار حجاب است ہمام	آں ہم امید کہ روزے ز میاں برخیزد

اُردو میں مرزا کا یہ شعر کم و بیش اسی مفہوم کا ترجمان ہے ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

حضرت اثرؔ فرماتے ہیں کہ مرزا نے یہ شعر میرؔ کے مندرجہ ذیل شعر سے متاثر ہو کے کہا ہے ؎

مری نمود نے مجھ کو کیا برابرِ خاک میں نقشِ پا کی طرح پائمال اپنا ہوں

لیکن ہماری رائے میں یہ دُرست نہیں کیوں کہ محض معنی کی ذراسی مطابقت پر ایسا قیاس کرنا واجب نہیں۔ کسی فارسی اُستاد کا شعر ہے ؎

دودِ چراغ خوردہ شب آوردہ ام بروز معذورم ار نماندہ دماغِ مرا تری

اُردو میں مرزا کا اس سے ملتا جُلتا شعر دیکھئے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ فارسی شعر کے مصرعہ ثانی میں معنوی پہلو کسی قدر مختلف ہے ؎

تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سخن مجھے تریاکیٔ قدیم ہوں دودِ چراغ کا

فارسی شاعر کہتا ہے کہ چراغ کے دھوئیں میں بیٹھ کر رات گزار دی ہے اس لیے اگر دماغ میں تری باقی نہیں رہی ہے تو معذور ہوں۔ مرزا کہتے ہیں کہ چراغ کے دھوئیں یعنی فکرِ سخن کا پرانا افیونی ہوں۔ شعر کہنے کا نشہ نیا نہیں ہے۔ یاسمن کنیزک کا شعر ہے ؎

یاد آیا مجھے گھر دیکھ کے دشت دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

مرزا کہتے ہیں ؎

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

مومنؔ نے بھی دو شعروں میں یہی مضمون خوب باندھا ہے ؎

۱۔ صبر وحشت اثر نہ ہو جائے کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے

۲۔ جائیں وحشت میں سوئے صحرا کیوں کم نہیں اپنے گھر کی ویرانی

یاسمن نے شعر میں الفاظ کے اُلٹ پھیر سے خانہ ویرانی کا نقشہ موثر انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مرزا کا شعر پہلو دار ہے۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ دشت کو سنسان اور ویران دیکھ کر گھر اور اس کی آسائش یاد آگئی اور دوسرا یہ کہ گھر اتنا ویران ہے کہ دشت کی ویرانی دیکھ کر اس کی ویرانی یاد آگئی۔ مومنؔ پہلے شعر میں کہتے

ہیں۔ ہم عالمِ جنوں میں صحرا کی طرف چل دیئے اور صبر سے وہیں بیٹھے رہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ صحرا بھی گھر ہی کا منظر پیش کرے کیوں کہ صحرا میں صبر و حشت کا اثر دکھائے یہ ایک قدرتی بات ہے۔ پھر کیا کریں صحرا چھوڑ کر کہاں جائیں۔ مومن کا دوسرا شعر بالکل صاف ہے۔

مومن کا ایک اور شعر ہے ؎

نہ جاؤں گا کبھی جنّت کو میں نہ جاؤں گا　　اگر نہ ہووے گا نقشہ تمہارے گھر کا سا

مرزا کا ہم مضمون شعر دیکھیے۔ اس میں بھی اس نے پہلو دار طرزِ ادا اختیار کی ہے ؎

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی　　گھر ترا خلد میں گر یاد آیا[1]

مومن کہتا ہے کہ اگر جنّت محبوب کے گھر کے مانند نہ ہوگی تو وہ ہرگز وہاں نہیں جائے گا۔ مرزا کے شعر کا مطلب بھی یہی ہے یعنی محبوب کے گھر کو خُلد پر ترجیح دی ہے۔ دونوں شعروں کا مرکزی خیال یہ ہے کہ محبوب کا گھر بہر صورت جنّت سے بہتر ہے۔ میرؔ کا شعر ہے ؎

مت ڈھلک مژگاں سے میری اے سرشکِ آبدار
مُفت ہی جاتی رہے گی تیری موتی کی سی آب

آتشؔ کہتا ہے ؎

مری آنکھوں سے کیا نسبت کہ قطرہ آبِ نیساں کا
دُرِ نایاب ہو سکتا ہے آنسو ہو نہیں سکتا

اور مرزا فرماتے ہیں ؎

توفیق باندازۂ ہمّت ہے ازل سے　　آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

تینوں شعروں میں بنیادی خیال ایک ہے یعنی قطرۂ اشک کا گراں بہا ہونا۔ مرزا محمد عسکری صاحب کی رائے میں مرزا نے میرؔ سے مضمون لیا ہے۔ ممکن ہے ایسا ہو لیکن غور سے دیکھا جائے تو خواجہ آتشؔ کا شعر مرزا کے شعر سے زیادہ قریب ہے۔ مرزا نے اپنے مخصوص اندازِ بیان سے مضمون کو بلند کر دیا ہے۔

خاقانی کا شعر ہے ؎

محبّت را پس از قطعِ محبّت لذّتے باشد　　کہ شاخِ نخلِ پیوندی بہ از اوّل ثمر گیرد

[1] اس شعر کی شرح "پہلو دار انداز" کے عنوان کے تحت دی گئی ہے۔

مرزا کے ہاں بھی یہ مضمون پایا جاتا ہے لیکن دوسرے پیرائے میں ؎

میں سادہ دل آزردگیٔ یار سے خوش ہوں یعنی سبقِ شوقِ مکرّر نہ ہوا تھا

خاقانی کہتا ہے۔ محبت قطع ہو جائے تو اس کا سلسلہ ازسرِنو شروع ہونے پر اس میں زیادہ لذت ملتی ہے جس طرح پیوند لگانے کے بعد درخت میں زیادہ میٹھے پھل لگتے ہیں۔ مرزا فرماتے ہیں۔ میں دوست کے آزردہ ہونے پر اس لیے خوش ہوں کہ آزردگی کے بعد صلح ہو جانے پر تجدیدِ شوق کا لطف دوبارہ حاصل ہوگا لیکن یہ میری سادہ دلی ہے۔ ایسا ہونا ممکن نہیں۔ مصطفٰے علی خاں خوشدل کا شعر ہے ؎

بوسم منِ بے برگ و نوا برگِ حنا را تا بوسہ بہ پیغام دہم آں کفِ پا را

مرزا کے مندرجۂ ذیل شعر کا مضمون اس کے ساتھ لڑ گیا ہے ؎

مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا کس قدر یا رب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

خوشدل کہتا ہے کہ برگِ حنا جو محبوب کے کفِ پا تک مہندی کی صورت میں پہنچتا ہے اس کو چوم کر وہ بوسہ بہ پیغام کا کام لے گا۔ مرزا کہتے ہیں کہ عاشق محبوب کی پائے بوسی کی بیحد حسرت رکھتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرنے کے بعد اس کی خاک سے مہندی اُگتی ہے تاکہ اُسے معشوق کے قدموں تک رسائی حاصل ہو۔ مومن کا شعر ہے ؎

دل قابلِ محبتِ جاناں نہیں رہا وہ ولولہ وہ جوش وہ طغیاں نہیں رہا

اس سے ملتا جلتا مرزا کا شعر دیکھیے ؎

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

مومن کہتا ہے۔ چوں کہ اب دل میں وہ پہلا سا ولولہ، جوش اور طوفان نہیں رہا۔ محبوب سے محبت کرنے کے قابل نہیں رہا۔ مرزا کہتے ہیں کہ وہ دل جس پر انہیں اس لئے ناز تھا کہ اس میں عشق کے دم بھرنے کا حوصلہ تھا اب محبوب کی بیوفائی اور بے اعتنائی کے صدمے اُٹھاتے اُٹھاتے اس قابل نہیں رہا کہ عشق کی نیاز مندی کا دعوےٰ کرے۔ مرزا کا اندازِ بیان بہتر ہے۔ مُلا نظیری کا ایک اور شعر ہے ؎

آں شکارم من کہ ہم لائقِ بہ کُشتن نیستم شرم مے آید مرا زانکس کہ صیّادِ من است

مرزا کا یہ شعر زبانِ حال سے نظیریؔ کے مضمون کو خفیف سے فرق کے ساتھ دُہرا رہا ہے۔ ؎

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں ‏ ‏ شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

دونوں شعروں کا مرکزی خیال یہی ہے کہ میں ایک صیدِ زبوں ہوں اور صیاد یا قاتل یعنی محبوب کے ہاتھ سے قتل ہونے کے لائق نہیں۔ خواجہ حافظؔ کا شعر ہے ؎

میانِ عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست ‏ ‏ تو خود حجاب خودی حافظؔ از میاں برخیز

اس کے ساتھ مرزا کا یہ شعر دیکھئے ؎

وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن ‏ ‏ غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

آصفی شیرازی کا شعر ہے ؎

تو ہم ز آئینہ حیراں ز حسنِ خویشتنی ‏ ‏ زمانہ ایست کہ ہر کس بخود گرفتار است

مرزا نے اس مضمون کو دوسرے پہلو سے باندھا ہے ؎

شکوہ سنجِ رشک ہمدیگر نہ رہنا چاہیئے ‏ ‏ میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا

فارسی شاعر کہتا ہے۔ اے محبوب! تو بھی آئینہ میں اپنا ہی حسن دیکھ کر حیران ہے۔ اسی طرح ہر شخص اپنے ہی حال میں گرفتار ہے۔ مرزا کہتے ہیں۔ اے محبوب! تو ہر وقت آئینہ دیکھنے میں مشغول ہے اور میں ہمیشہ غم والم میں بسر بزانو رہتا ہوں۔ اس لیئے ایک دوسرے پر رشک کرنے کی شکایت بیجا ہے۔ فارسی میں کسی کا شعر ہے ؎

ہر کس کہ بشنود شود ش ذوقِ عاشقی ‏ ‏ از بسکہ حرفِ عشق بہ لذت ادا کنم

مرزا نے ادنےٰ سے تغیر کے ساتھ یہی خیال اپنے انداز میں یوں ادا کیا ہے ؎

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا ‏ ‏ بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

فارسی شاعر کہتا ہے کہ میں داستانِ عشق کو اس لذت کے ساتھ بیان کرتا ہوں کہ جو کوئی سُنتا ہے اس میں عاشقی کا ذوق پیدا ہو جاتا ہے۔ مرزا کہتے ہیں ایک تو اس حسین کا ذکر ہے اور پھر اس کا حسن بیان کرنے والا مجھ جیسا جادو بیان عاشق۔ سُننے والے پر اثر کیوں نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ میرا رازداں بھی اس کا عاشق ہو کر میرا رقیب بن گیا۔ رازداں کے رقیب بن جانے کی تخصیص نے شعر میں زور پیدا کیا ہے۔

نظیری کا شعر ہے ؎

توحیدِ حق بیانِ نظیری بلند ساخت — برتر نہند پایۂ عرشِ عظیم را

اور مرزا کہتے ہیں ؎

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے — عرش سے ادھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا

حضرت اخلاق حسین عارف مرزا کے شعر کا مطلب یوں لکھتے ہیں :۔ "ابھی تک ہمارے تصوّر کی پرواز میں خدا کا تعلق یہ ہے کہ وہ عرش پر متمکن ہے۔ کاش ہمارا تصوّر ذاتِ باری کے متعلق اس سے بالاتر فضا میں پرواز کر سکتا تاکہ ہمارا مطمحِ نظر اس کے متعلق زیادہ واضح اور متعین ہوتا اُسے عرش پر متمکن سمجھ لینا ہمارے تصوّر کی کوتاہی ہے۔" اس کے بعد عارف صاحب کہتے ہیں کہ یہ خیال نظیری کے مندرجہ صدر شعر سے زیادہ واضح ہو جاتا ہے [1]

میر کا شعر ہے ؎

ذلیل اس کی گلی میں ہیں تو ہیں آزردگی کیسی — کہ رنجش تو وہاں ہووے جہاں ہو اعتبار اپنا

مرزا کہتے ہیں ؎

دے وہ جس قدر ذلّت ہم ہنسی میں ٹالیں گے — بارے آشنا نکلا اُن کا پاسباں اپنا

میر محبوب کی گلی میں ذلیل ہونے پر اس واسطے رنجیدہ نہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ اُن کا اعتبار نہیں اور مرزا کو محبوب کے پاسباں کی ذلّت برداشت کرنے اور اسے ہنسی میں ٹالنے کے لیے یہ بہانا مل جاتا ہے کہ وہ ان کا جانا پہچانا نکلا۔ وہ خیال کریں گے کہ پاسبان پرانی رسم و راہ کی بنا پر ان سے دل لگی کر رہا ہے۔ کیا عجب کہ مرزا کو میر کے شعر نے مضمون سجھا دیا ہو مگر مرزا نے اسے ایسے ڈھنگ سے پیش کیا ہے اور ایسا اسلوبِ بیان اختیار کیا ہے کہ ان کی ذاتی تخلیق معلوم ہوتی ہے۔ عمر خیام کا شعر ہے ؎

گر میلِ تو با بے خرد و نا اہل است — من نیز چناں اہل و خردمند نیم

اس کے ساتھ عرفی کا یہ شعر دیکھیے ؎

از من بگیر عبرت و کسبِ ہنر مکن — با بختِ خود عداوتِ ہفت آسماں مخواہ

---

[1] ماہنامہ "فروغِ اردو" لکھنؤ۔ غالب نمبر، نومبر۔ دسمبر ۱۹۶۹ء۔

اب اس کے مقابل مرزا کا یہ شعر دیکھئے ؎

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے　　بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

خیامؔ کہتا ہے کہ نااہل اور نادان کو چاہتے ہو تو مجھے دیکھو۔ میں بھی تو کوئی عقل مند نہیں ہوں۔ عرفیؔ کسبِ ہنر کو آسماں کی دشمنی کا سبب بتاتا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ وہ نہ تو دانا تھے اور نہ کسی ہنر میں یکتا۔ آسماں بے سبب ان کا دشمن بنا۔

اس سلسلے میں مومنؔ کا یہ شعر بھی ملاحظہ فرمایئے جس میں بلاغت کی داد دی گئی ہے ؎

دیکھئے پسِ مردن حالِ جسم و جاں کیا ہو　　مدّعی زمیں اپنی دشمن آسماں اپنا

یہ شعر بظاہر ہم مضمون نہیں لیکن بہ ہمہ وجوہ بلیغ ہے۔ کہتا ہے زمین و آسمان کو جسم و جاں سے عداوت ہے دیکھئے مرنے کے بعد کیا حال ہو۔

علامہ فیضیؔ کا شعر ہے ؎

بے جنبشِ امرا دبدستاں　　برگے نہ چمد دریں گلستاں

مرزا کہتے ہیں ؎

غافل بوہم ناز خود آرا ہے ورنہ یاں　　بے شانۂ صبا نہیں طرّہ گیاہ کا

ان دونوں شعروں میں بھی مرکزی خیال ایک ہے یعنی جو کچھ ہوتا ہے خدا کی مرضی اور حکم سے ہوتا ہے اس کے بغیر پتّا بھی نہیں ہلتا۔ مرزا نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ اس حقیقت کے باوجود غافل انسان اپنی تدبیر اور کارکردگی پر نازاں ہونے کے وہم میں مبتلا ہے اور خود آرائی کا دم بھرتا ہے۔ مومنؔ کا شعر ہے ؎

میں کینہ سے بھی خوش ہوں کہ سب یہ تو کہتے ہیں

اس فتنہ گر کو لاگ ہے اس مبتلا کے ساتھ

مرزا کہتے ہیں ؎

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ　　جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

مومنؔ کہتا ہے کہ محبوب اس سے کینہ رکھتا ہے لیکن وہ اس پر بھی خوش ہے کیوں کہ لوگوں کی نظر میں اس طرح محبوب کا اس کے ساتھ تعلق ہے۔ کینہ پر بھی خوش ہونا

انتہائی جذبہ شوق و تسلیم کا نتیجہ ہے۔ مرزا کا مطلب یہ ہے کہ محبوب ان کے ساتھ عداوت بھی کرتا تو وہ اسے لگاؤ سمجھتے لیکن جب عداوت بھی نہ ہو تو کس بات پر دھوکا کھائیں۔
یہ مضمون مرزا کو بہت مرغوب تھا اور اسے انہوں نے پہلو بدل بدل کر باندھا ہے۔
نعمت خاں عالی کا شعر ہے ؎

زمُردم یارے نپرسد کہ عالی کیست طالع بیں   کہ عمرم در محبت رفت و کار آخر رسید اینجا

مرزا کہتے ہیں ؎

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے   کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

دونوں شعر بجائے خود خوب ہیں اور ہم معنی بھی یعنی عاشق نے دوست کی محبت میں تمام عمر گنوا دی اس پر بھی وہ ایسا رویہ اختیار کرتا ہے کہ گویا اس کی عاشق سے کبھی کی شناسائی نہ تھی۔ عالی نے مضمون صراحت سے بیان کیا ہے اور مرزا نے کنایہ میں۔ اس مضمون پر مومن کا شعر بھی ملاحظہ کیجیے ؎

کس پہ مرتے ہیں آپ پوچھتے ہیں   مجھے فکرِ جواب نے مارا

اس شعر کا بھی یہی مطلب ہے البتہ اندازِ بیان کا رنگ جداگانہ ہے۔ مصرعہ ثانی میں "فکرِ جواب نے مارا" کا ٹکڑا جواب نہیں رکھتا۔ میر کا شعر ہے ؎

آدم خاکی سے عالم کو جِلا ہے ورنہ   آئینہ تھا تو مگر قابلِ دیدار نہ تھا

مرزا فرماتے ہیں ؎

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی   چمن زنگار ہے آئینہ بادِ بہاری کا

میر کے شعر کا مفہوم یہ ہے کہ عالم ایک آئینہ تھا مگر آدم خاکی کے بغیر دیدار کے قابل نہ تھا یعنی روح لطیف جسم کثیف کے بغیر اپنا جلوہ دکھا نہیں سکتی اور مرزا اسی مضمون کو دوسرے الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں کہ بادِ بہاری کے آئینہ میں زنگ لگا تو اس کے سبز رنگ سے سبزہ زار یا چمن پیدا ہوا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کثافت کے بغیر لطافت وجود میں نہیں آسکتی۔ اتنا ضرور ہے کہ مرزا کی تمثیل میر کی تمثیل سے مختلف ہے۔
خاقانی کے دو شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

بے بادام چشماں مراکہ دیدی اندریں دنیا　　بگردِ خانہ چشمش زموراں کارواں بینی
شہنشاہے کہ برقصرش ہزاراں پاسباں بودے　　کنوں برقبۂ گورش کلاغاں پاسباں بینی

مرزا کہتے ہیں ؎

افسوس کہ دیداں کا کیا رزق فلک نے　　جن لوگوں کی تھی درخورِ عقدِ گہر انگشت

دونوں شاعروں کے یہاں حسینوں اور صاحبانِ جاہ وحشم یا قابلِ قدر لوگوں کے عبرتناک انجام کا مضمون مشترک ہے۔ اندازِ بیاں ذرا مختلف ہے۔ خاقانی نے پھیلا کے لکھا ہے اور مرزا نے اختصار کے ساتھ۔

اُستاد ذوق کا شعر ہے ؎

چھلّا نہیں تو چھلّے کا گُل اے نگار دے　　کچھ تو نشانی اپنی مجھے یادگار دے

مرزا کہتے ہیں ؎

کافی ہے نشانی ترے چھلّے کا نہ دینا　　خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت

ذوق یادگار کے طور پر دوست کی کوئی نشانی چاہتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ اگر تو چھلّا نہیں دیتا تو چھلّے کو گرم کر کے اس کا داغ ہی دے۔ کچھ تو نشانی دے۔ مرزا کو دوست نے رخصت ہوتے وقت خالی اُنگلی دِکھا کر کہا کہ میرے پاس نشانی کا چھلّا نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اُن کے لیے یہ نشانی کافی ہے کہ دوست نے خالی اُنگلی دکھا دی۔ خالی اُنگلی دکھانے کا دوسرا مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ اس نے شوخی سے انگوٹھا دکھا دیا۔

مومن کہتا ہے ؎

کیا بات میرے حرف پہ انگشت رکھ سکے　　ہر خط پہ نکتہ چیں کو ہے وہم وگمانِ تیغ

مرزا کہتے ہیں ؎

لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخنِ گرم　　تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

دونوں اُستاد اپنی خوبیٔ سخن کا دعوےٰ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کوئی شخص اُن کے کلام میں عیب نہیں نکال سکتا۔ سحابی استرآبادی کا شعر ہے ؎

زاں روخطِ مُشکیں شود برخاست　　آتش بنشست، دود برخاست

مرزا کہتے ہیں ؎

آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست　　دودِ شمعِ کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست

سحابی نے محبوب کے حسن کو آگ اور خط کے نمودار ہونے کو دھواں قرار دیا ہے۔ کہتا ہے خط کے نکل آنے پر فروغِ حسن میں زوال آگیا۔ مرزا کے شعر کا ماحصل بھی یہی ہے وہ خط کو بجھی ہوئی شمع کے دھوئیں سے تشبیہ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کے نمودار ہونے پر حسن کے زوال آنے سے دوست کا بازار سرد ہوا ہے یعنی خریدار کم ہو گئے ہیں۔ مضمون سحابی کا ہے اور حق تو یہ ہے کہ تشبیہوں سے اختصار و ایجاز کے ساتھ خوب باندھا گیا ہے مرزا نے اسی بات کو مقابلتہً صراحت سے بیان کیا ہے۔

شیخ ذوقؔ کا شعر ہے ؎

بیمارِ عشق کا جو نہ تجھ سے ہوا علاج　　کہہ اے طبیب تو ہی کہ پھر تیرا کیا علاج

مرزا کہتے ہیں ؎

لو ہم مریضِ عشق کے تیماردار ہیں　　اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

اور مومنؔ فرماتے ہیں ؎

بیمارِ اجل چارہ کو گر حضرتِ عیسیٰ　　اچھا بھی کریں گے تو کچھ اچھا نہ کریں گے

اس مضمون پر اور بھی بہت سے شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے۔ ذوقؔ طبیب سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔ اگر بیمارِ عشق کا تجھ سے علاج نہ ہوا تو تو ہی بتا کہ تیرے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیئے یا تجھے کیا سزا دینی چاہیئے۔ مرزا کا مطلب یہ ہے کہ اگر مریضِ عشق کے علاج کے لیئے تیماردار کا ہونا ضروری ہے تو لو ہم اس کی تیمارداری اپنے ذمّے لیتے ہیں لیکن اگر وہ پھر بھی اچھا نہ ہوا تو مسیحا یا چارہ گر کو کیا سزا ملنی چاہیئے۔ مومنؔ کے شعر کا مفہوم یہ ہے کہ اس بیمار کو جس کی دوا صرف موت ہے حضرتِ عیسیٰ بھی اچھا نہیں کر سکتے۔ اس شعر کا مصرعۂ ثانی پہلودار واقع ہوا ہے یعنی اس سے یہ معنی بھی برآمد ہوتے ہیں کہ حضرتِ عیسیٰ بیمارِ عشق کو اچھا بھی کریں گے تو اُن کا یہ عمل اچھا نہ ہوگا کیوں کہ بیمارِ عشق کو بیمار رہنا ہی پسند ہے۔ معنی کے اس پہلو سے قطع نظر تینوں شعر ہم مضمون ہیں یعنی مریضِ عشق کا علاج طبیب یا حضرتِ عیسیٰ سے

بھی نہیں ہو سکتا۔

خواجہ آتش کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

ہو گیا سلسلۂ مہر و محبت برہم ــــ ناز نیں بھول گئے ناز و ادا میرے بعد

مرزا کہتے ہیں ؎

منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا ــــ ہوئی معزولیٔ انداز و ادا میرے بعد

مولانا آسی فرماتے ہیں۔ یہ ایک توارد ہے کیوں کہ مضمون بالکل پامال اور عام ہے مگر غالب نے مناسب الفاظ جمع کر کے شعر میں جان ڈال دی ہے۔ ہماری رائے میں یہ درست نہیں۔ آتش کا شعر بہت بلند ہے۔ مرزا مضمون کو ترقی دینا تو درکنار اس کی برابری کرنے میں بھی ناکام رہے ہیں۔ مرزا فاخر مکیں کا ایک شعر ہے ؎

زن سیر تانِ دورِ جہاں را خبر کنید ــــ ساقی گرفت ساغرِ مرد آزمائے ما

یعنی ساقی شرابِ مرد آزما کا ساغر ہاتھ میں لیے ہوتے ہے۔ زمانے کے نامردوں کو خبر کر دو۔ کوئی ایسا ہے جو اس شراب کو پیے"۔

علامہ فیضی نے اس مضمون کو بلیغ کر دیا ہے ؎

گردِ فنا شدند حریفانِ بزمِ عشق ــــ بر خاک ریز جرعۂ مرد آزمائے ما

مطلب یہ کہ بزمِ عشق کے مردِ میداں جو شرابِ مرد آزما کے پینے والے تھے فنا ہو کر خاک میں مل گئے۔ اب چوں کہ اس شراب کا کوئی پینے والا باقی نہ رہا اسے خاک پر ڈال دو۔ یہ خاک ہی اب اس کو پی سکتی ہے۔

مرزا کا شعر ہے ؎

کون ہوتا ہے حریفِ مےَ مرد افگنِ عشق ــــ ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

کہتے ہیں۔ میرے بعد شرابِ عشق کا کوئی خریدار نہیں رہا۔ مے مرد افگنِ عشق کا ساقی یعنی معشوق لوگوں کو بار بار اس کی دعوت دیتا ہے لیکن کوئی نہیں آتا۔ پھر وہ مایوسانہ لہجہ میں کہتا ہے۔ کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگنِ عشق! یعنی کوئی نہیں ہوتا۔

مرزا نے اپنے مخصوص انداز میں پہلو دار طرزِ ادا اختیار کر کے شعر کو زیادہ معنی خیز

بنا دیا ہے اور اسے ایسا لہجہ بخشا ہے کہ فارسی کے دونوں شعروں پر سبقت لے گیا ہے۔

عرفی کا شعر ہے ؎

چشم نہ بہر خویش دم نزع تر شود
ترسم کہ من بمیرم و غم در بدر شود

مرزا کہتے ہیں ؎

آئے ہے بیکسیٔ عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

ان دونوں شعروں کے ساتھ مومنؔ کا یہ شعر بھی دیکھئے ؎

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے

عرفیؔ اپنی موت پر نہیں بلکہ اس بات پر آب دیدہ ہوتا ہے کہ اس کے بعد غم کو کہیں جگہ نہیں ملے گی اور دربدر ہو جائے گا۔ مرزا عشق کو سیلابِ بلا سے تعبیر کرتے ہیں اور اپنے مرجانے کے بعد انہیں اس کے لیے کہیں ٹھکانا نظر نہیں آتا۔ اس لیے اس کی بے کسی پر انہیں رونا آتا ہے۔ مومنؔ کہتا ہے کہ اس کے مرجانے کے بعد شبِ ہجراں بے گھر ہو جائے گی اس لیئے اسے ہدایت کرتا ہے کہ وہ پہلے ہی سے اپنا ٹھکانا ڈھونڈھ لے مضمون کے اعتبار سے تینوں شعر ہم رنگ ہیں مگر ہر ایک کا اندازِ بیان کسی قدر متفاوت ہے۔ عرفیؔ کے شعر میں وسعتِ مضمون زیادہ ہے مگر غالبؔ کا اندازِ بیان زور دار ہے۔ مومنؔ کے شعر میں دوسرا رنگ ہے۔

امیر خسروؔ کا شعر ہے ؎

خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند
آرے آرے می کنم با خلق و عالم کار نیست

مرزا کہتے ہیں ؎

چھوڑوں گا میں نہ اس بتِ کافر کا پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

حضرت وجاہت علی سندیلوی نے یہاں بھی مرزا کے شعر پر دور از کار حاشیہ آرائی کرکے اسے خسروؔ کے شعر کے مقابلے میں بہتر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ ظاہر ہے کہ دونوں نے ایک ہی بات کہی ہے یعنی یہ کہ دونوں بت پرست ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ خسروؔ لوگوں کے معترض ہونے پر ان کی پروا نہیں کرتے اور مرزا اس واسطے پرستش

نہیں چھوڑ سکتے کہ دل کے ہاتھوں مجبور ہیں۔

مُلا محمد طاہر غنی کشمیری کا شعر ہے ؎

رہینِ منتِ گوشِ گرانِ خویشتنم | کہ تا بلند نہ گردد سخن نمے شنوم

طالب آملی نے ذرا پہلو بدل کر یوں کہا ہے ؎

اے کاش گوشِ رغبتم احول شدے چو چشم | تا ہرچہ گفتی از تو مکرر شنیدمے

مرزا اس طرح کہتے ہیں ؎

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات | سنتا نہیں ہوں بات مکرّر کہے بغیر

مرزا کا شعر غنی اور طالب آملی کے اشعار کی مجموعی صورتِ خیال کا خاکہ پیش کرتا ہے۔ باوجود اتحادِ خیال اندازِ بیان میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ عجب نہیں توارد واقع ہوا ہو۔

مومن کا ایک شعر ہے ؎

ہے ایک خلق کا خوں سر پہ اشکِ خوں کے مرے | سکھائی طرز اُسے دامن اٹھا کے آنے کی

اس کے ساتھ مرزا کا یہ شعر دیکھیے ؎

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق | لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

مومن کہتا ہے کہ اس کے اشکِ خونیں کو دیکھ کر محبوب نے دامن اٹھالیا کہ آلودۂ خوں نہ ہو جائے۔ اس کی یہ ادا ایسی تھی کہ لوگ اسے دیکھ کر ہلاک ہو گئے۔ لہٰذا سب کا خون اس کے اشکِ خونیں کی گردن پر رہا۔ مرزا کہتے ہیں کہ موجِ مے اس خیال سے کہ محبوب کی مستانہ رفتار سے عالم کا خون ہو جائے گا لرز رہی ہے اور چوں کہ محبوب کی مستی کا باعث شیشۂ شراب ہے خونِ خلق گردنِ مینا پر ثابت ہوا ہے۔

مرزا بیدل کا ایک شعر ہے ؎

چو رسی بہ طورِ ہمت ارنی مگو و مگریز | کہ نمیرزد ایں تمنا بجوابِ لن ترانی

اور عرفی کہتا ہے ؎

نہ کوتہی ز عطا بود عشق میداند | کہ بر کرشمۂ ما تنگ بود خلعتِ طور

مرزا فرماتے ہیں ؎

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر | دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

ان تینوں شعروں میں بلند ہمّتی اور عالی ظرفی کی تعریف مقصود ہے لیکن ان میں بھی مضمون بیان کرنے کا عالم ایک دوسرے سے اتنا بعید ہے کہ اخذ و استفادہ کا گمان نہیں ہوتا۔[1]

میرؔ کا شعر ہے ؎

ریزۂ الماس یا مشتِ نمک ہے کیا بُرا | جو میں اپنے ایسے زخمِ سینہ کو مرہم کروں

اس کے ساتھ مرزا کا یہ شعر دیکھیے ؎

فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویشِ مرہم سے | ہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر

میرؔ زخمِ سینہ کے لیئے مرہم کی ضرورت اس واسطے محسوس نہیں کرتا کہ وہ ریزۂ الماس یا مُشتِ نمک کو بُرا نہیں سمجھتا۔ مرزا کہتے ہیں کہ ان کے پارہ ہائے دل کو نمک سے ایسی لذّت حاصل ہوتی ہے کہ وہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں لڑتے جھگڑتے ہیں۔ اس جھگڑے سے تنگ آ کر انہوں نے پارہ ہائے دل کو اس لذّت سے محروم کر دیا۔ اس لیے اب انہیں تشویشِ مرہم دامن گیر ہے۔ میرؔ کا شعر سلاست کا جامہ پہنے ہے اور اس میں کسک پائی جاتی ہے۔ مرزا کے یہاں شاعرانہ اندازِ بیان ہے لیکن تکلّف سے خالی نہیں۔ مرزا ؎

لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاںتاب کا دھوکا | ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور

یہ شعر پڑھ کر شیخ ناسخؔ کے مشہور مطلع کی یاد تازہ ہو جاتی ہے ؎

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا | طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

مرزا نے یہ کہہ کر کہ وہ ہر روز اپنا داغِ نہاں دکھاتے ہیں جس کو دیکھ کر لوگوں کو آفتابِ عالمتاب کا دھوکا ہوتا ہے، باوجود مبالغہ آمیزی کے اپنا خیال بخوبی ظاہر کیا ہے۔ ناسخؔ کا شعر فقط

---

[1] اس سلسلے میں عرفیؔ کے شعر کا مطلب بیان کرتے ہوئے حضرت آسیؔ لکھتے ہیں "یعنی عطا نے ہمارے ساتھ کوتاہی نہیں کی تھی۔ اس نے اپنے نزدیک ہم کو خلعتِ موزوں دیا تھا مگر ہمارا عشق جانتا ہے اور اس بات کا گواہ ہے کہ دربارِ عطا سے جو ہم کو خلعتِ طور عنایت ہوا وہ ہمارے کرشمہ اور ہمارے حال پر تنگ تھا۔ یعنی ہم پر برقِ طور سے بھی کچھ زیادہ گرنا چاہیئے تھا"۔

چستی بندش اور پُر شکوہ الفاظ کی بدولت ایک شاندار مطلع نظر آتا ہے۔ معنوی لحاظ سے اس میں کوئی خاص بات نہیں۔

مرزا بیدل کا ایک اور شعر ہے ؎

درطینتِ فسردہ صفاہا کدورت است　　　آئینہ می کند ہمہ زنگار آب را

اس کے ساتھ مرزا کا یہ شعر پڑھیے ؎

صفائے حیرتِ آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر　　　تغیر آبِ برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر

بیدل نے افسردہ دل کی صفائی کو آئینہ اور کدورت کو زنگ کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور مرزا نے آئینہ پر صفائی حیرت کی وجہ سے زنگ آنے کو ایک جگہ ٹھہرے ہوئے پانی پر جمی ہوئی کائی کے ساتھ۔ انہوں نے بیدل کے مضمون سے مضمون پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن خیال بندی کی دلدل میں ایسے پھنس گئے کہ مفہوم اُلجھ کر رہ گیا ہے۔

بیدل کے اور دو شعر دیکھیے ؎

منزلِ عیش بوحشتکدۂ امکاں نیست　　　چمن از سایۂ گُل پشتِ پلنگ است اینجا

از وحشتِ ایں بزم بعشرت نتواں زیست　　　ہر چند چراغانش گُلِ پشتِ پلنگ است

مرزا کے مندرجۂ ذیل شعر کا ماخذ بیدل کے یہی دو شعر ہیں ؎

نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی　　　ہوا جامِ زمرد بھی مجھے داغِ پلنگ آخر

بیدل نے سایۂ گل اور چراغاں سے اور مرزا نے جامِ زمردیں سے عیش و عشرت کی نشاندہی کی ہے اور دونوں نے اظہارِ وحشت کے لیے پشتِ پلنگ یا داغِ پلنگ کی تشبیہ سے کام لیا ہے۔ تینوں شعروں کا مفہوم ایک ہے یعنی سامانِ عیش و عشرت سے وحشت کا علاج نہیں ہو سکتا۔ نواب صدیق حسن خاں کا شعر ہے ؎

تنہا نہ ہمیں جان و دلم در تب و تاب است　　　چوں کاغذِ آتش زدہ یک شہر شرارم

مرزا نے اسی مضمون کا خاکہ یوں کھینچا ہے ؎

بہ رنگِ کاغذِ آتش زدہ نیرنگِ بے تابی　　　ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر

فارسی شعر کا مطلب بالکل واضح ہے۔ مرزا نے مضمون کو دقیق بنانے کی کوشش میں ایسی

طرزِ ادا اختیار کی ہے کہ بندش میں بہت گنجلک رونما ہوئی ہے اور کھینچا تانی کے بعد ہی کچھ معنی دستیاب ہو سکتے ہیں ۔ ملا نظیری کے اور دو شعر دیکھئے ؎

نقدے کہ دوراں بردہ است از کیسۂ عمرم بروں — جاوید مستغنی شوم از صد دہد گر نیم را
نشاطِ رفتہ زدوراں بہ صبر بستانم — کہ بد معاملہ آزردہ از تقاضا نیست

مرزا کہتے ہیں ؎

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے — متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

نظیری زمانے کے ہاتھوں لٹ جانے کا ذکر کرتا ہے اور تھوڑی سی نقدی حاصل کرنے پر راضی ہے۔ کہتا ہے چوں کہ زمانہ بد معاملہ ہے وہ تقاضے پر آزردہ نہ ہو گا۔ مرزا ان دو شعروں کے یکجائی مضمون کا رُخ کسی قدر بدل دیتے ہیں وہ لٹے ہوئے مال کو فلک کے ذمے قرض سمجھ کر اس کی واپسی کا تقاضا کر رہے ہیں حالاں کہ اس کے واپس ملنے کی اُمید فضول ہے۔ غالب نے رہزن کی تمثیل کا اضافہ کر دیا ہے۔

امیر خسرو کا شعر ہے ؎

تو آں قاتل کہ از بہرِ تماشا خونِ من ریزی — من آں بسمل کہ زیرِ خنجرِ خوں خوار می رقصم

مرزا کا مندرجۂ ذیل شعر نہ صرف معنی کے اعتبار سے خسرو کے شعر سے ہم آغوش ہے بلکہ اندازِ بیاں اور تاثیر میں زبانِ حال سے اس کی برابری کا دعوے دار ہے ؎

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے — تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

مومن کا ایک شعر ہے ؎

اتنا تو نہ گھبراؤ راحت یہیں فرماؤ — گھر میں مرے رہ جاؤ آج اور بھی کل جانا

مرزا نے نواب زین العابدین خان عارف پر جو مرثیہ لکھا ہے۔ اس کا ایک شعر اسی رنگ میں ہے ؎

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں — مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

دونوں نے موقع و محل مختلف ہوتے ہوئے بھی ایک ہی بات کہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مومن دوست کے مختصر قیام سے مطمئن نہ ہو کر اس سے التجا کرتا ہے کہ کم از کم ایک اور

دن کے نئے ٹھہرے اور مرزا اس خیال سے کہ ہمیشہ کے لیے یہاں کوئی رہ تو نہیں سکتا استدعا کرتے ہیں کہ کوئی دن اور رہو۔

راقم مشہدی کا ایک شعر ہے ؎

می کند وعدۂ دیدار بہ فردا امروز ۔۔۔ یار دانستہ کہ امروزِ مرا فردا نیست

اور میر حسن کہتا ہے ؎

یں حشر کو کیا روؤں کہ اُٹھ جانے سے تیرے ۔۔۔ برپا ہوئی اک مجھ پہ قیامت تو ہیں اور

مرزا نے اسی مرثیہ میں ایک اور شعر کہا ہے ؎

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے ۔۔۔ کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ان تینوں شعروں میں تخیل متحد ہے۔ مرزا کا شعر اندازِ بیان کے لحاظ سے میر حسن کے شعر سے بالکل قریب ہے۔ موقع و محل مختلف ہونے کی وجہ سے طرزِ ادا میں تھوڑا سا فرق ہے اور یہ لازمی تھا۔ زبان کی بے تکلفی اور صفائی بیان کے پیشِ نظر مرزا کا شعر قابلِ تعریف ہے

میر کا شعر ہے ؎

منتظر قتل کے وعدے کا ہے اپنے یعنی ۔۔۔ جیتا مرنے کے لیے ہے یہ گنہگار ہنوز

اسی مرثیہ کے مقطع میں مرزا نے بھی ایسے ہی مضمون کہا ہے یعنی دونوں کے شعروں میں بنیادی خیال ایک ہے ؎

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب ۔۔۔ قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

نعمت خان عالی کا شعر ہے ؎

گفتی دعائے زلفِ تو تحصیلِ حاصل است ۔۔۔ با خضر کس نہ گفت کہ عمرت دراز باد

مرزا کہتے ہیں ؎

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز ۔۔۔ دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز

عالی کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ محبوب کی درازیٔ زلف کے لیے دعا مانگنا بے معنی ہے کیوں کہ اس میں درازی پہلے ہی موجود ہے۔ حضرتِ خضر کی درازیٔ عمر مسلم ہے کسی نے ان سے "عمرت دراز باد" نہیں کہا۔ مرزا نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے لیکن دوسرے

رُخ ہے۔ فرماتے ہیں کسی مشکل مقصد کے حل ہونے میں عجز و نیاز کا منتر بے کار ہے لہٰذا اب ایسی چیز کے لیے دعا مانگیں جو پہلے سے دی جا چکی ہو یعنی حضرت خضر کی درازیٔ عمر۔

شیخ ذوقؔ کا شعر ہے ؎

تو جان ہے ہماری اور جان ہے تو سب کچھ ۔۔۔ ایمان کی کہیں گے ایمان ہے تو سب کچھ

مرزا کہتے ہیں ؎

کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز ۔۔۔ کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

ذوقؔ کا شعر سلیس اور صاف ہے اور مرزا کا پہلودار۔ اس میں مقابلتہً گہرائی پائی جاتی ہے۔

میرؔ کا شعر ہے ؎

نہ تسلّی ہوا دلِ بے تاب ۔۔۔ نہ تھما چشمِ تر سے خونِ ناب

مرزا کہتے ہیں ؎

جگرِ تشنۂ آزار تسلّی نہ ہوا ۔۔۔ جوئے خوں ہم نے بہائی بنِ ہر خار کے پاس

میرؔ کی آنکھوں سے لگاتار خون کے آنسو جاری ہونے پر اس کے دلِ بے تاب کی تسلی نہ ہوئی اور مرزا کا جگر جو آزار کا پیاسا ہے ہر کانٹے کی جڑ کے پاس تلوؤں سے لہو کی ندیاں بہانے پر بھی مطمئن نہیں ہوا۔ دونوں شعر ہم مضمون ہیں۔

میر والہیؔ کا شعر ہے ؎

آمدی بر سرِ خاکِ من و شرمندہ شدم ۔۔۔ کیں زماں از پئے قربانِ تو جاں می بایست

میرؔ نے دو شعروں میں یوں کہا ہے ؎

ہمیں تو نزع میں شرمندہ آ کے اس نے کیا ۔۔۔ رہا ہے ایک رمق جی سو کیا نثار کریں

آیا تو سہی وہ کوئی دم کے لیے لیکن ۔۔۔ ہونٹوں پہ مرے جب نفسِ باز پسیں تھا

ظفرؔ کا یہ شعر بھی دیکھیے ؎

اپنے بیمار کی آئے وہ عیادت کے لیے ۔۔۔ جب یہ جانا کہ ہو جان اس میں تو شاید رمقے

اب مرزا کا شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے ۔۔۔ خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس

میر والہی اس بات پر شرمندہ ہے کہ وہ محبوب پر جان نچھاور نہیں کر سکتا کیوں کہ وہ

اس کی قبر پر اس وقت آیا جب اس کے پاس جان موجود نہیں۔ میر کے شعر کا بھی قریب قریب یہی مفہوم ہے۔ کہتا ہے محبوب نے عالم نزع میں اسے دیدار کا فخر بخشا مگر اسے اس بات کی شرمندگی ہے کہ اس وقت اس میں ذرا سی جان باقی رہ گئی ہے جو محبوب پر نثار کرنے کے شایاں نہیں۔ ظفر کہتا ہے کہ محبوب اس کی بیمار پُرسی کو اس وقت آیا جب اس نے جان لیا کہ ظفر بس اب تھوڑی سی جان باقی ہو گی اور وہ مرنے والا ہی ہو گا۔ مرزا کے شعر کا مطلب کسی قدر مختلف ہے۔ کہتے ہیں محبوب اُن کے پاس اس وقت آیا جب وہ دم توڑ رہے تھے۔ انہوں نے دیکھنے کے لیے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن کھولتے ہی کھولتے بند ہو گئیں اور حسرتِ دیدار بھی پوری نہ ہو سکی۔ میر والہی کا شعر بہت بلیغ ہے اور میر کا پہلا شعر اگرچہ مضمون کے لحاظ سے اس سے ملتا جلتا ہے ایسا برجستہ نہیں۔ مرزا نے عالم نزع میں مبتلا ہونے کی وجہ سے دیدار سے محروم رہنے کا حسرت ناک نقشہ کھینچا ہے۔ اس سلسلے میں میر حضوری کا مندرجہ ذیل شعر پیش کرنا خالی از دلچسپی نہیں ہے

بہ بالیں آمدی در وقتِ مُردن ناتوانے را — ازیں زحمت بہ مُردن ساختی مائل جہانے را

یہاں شاعر کے مضمون کا پہلو مختلف رنگ میں ہے۔ کہتا ہے۔ محبوب کا عاشق کے پاس مرتے دم آنا ایک ایسی زحمت ہے کہ ایک دنیا مرنے پر مائل ہو گئی۔ ان اشعار کے ساتھ مومن کا یہ شعر بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بہت خوب کہا ہے

وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب — تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

یعنی قتل ہونے کے بعد معشوق کا ان کی لاش پر آنا انہیں ناگوار ہے۔ اس لیے دوبارہ زندگی پانے کے متمنّی ہیں۔ یہ شعر میر والہی کے شعر سے بہت قریب ہے۔ یہ مضمون ذوق نے بھی سلاست اور اختصار کے ساتھ خوب باندھا ہے

دیکھا دمِ نزع دلا رام کو — عید ہوئی ذوق ولے شام کو

شیخ علی حزیں کا شعر ہے

کتانِ طاقتم را پردہ داری می کند حسنش — عرقش در شام ہا ماہتاب آلودہ را [illegible]

اس سے مرزا کے شعر کا مقابلہ کیجئے

نہ لیوے گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے　　لگادے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش

حزیں کہتا ہے کہ محبوب کا چہرہ اس چاند کے مانند ہے جو خطِ سیاہ کی شام میں بادلوں سے گھرا ہوا ہو۔ اس وجہ سے محبوب کا حسن میری طاقت کی پردہ داری کرتا ہے ورنہ اس کے پرزے اڑ جاتے کیوں کہ یہ مثل کتاں کے ہے جو چاند کی روشنی سے پھٹ جاتا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ محبوب کے رخسار کا سبزۂ خط جوہرِ آئینہ کو طراوت بخشتا ہے اور اسی وجہ سے خانۂ آئینہ میں آگ نہیں لگ سکتی ورنہ محبوب کا حسن اس قدر آتش ناک ہے کہ جوہرِ آئینہ اس کے شعلۂ رخسار کے عکس سے جل اٹھتا۔ دونوں شعروں کے مضمون کی نوعیت ایک ہے۔ صرف تمثیل مختلف ہے۔ ملا غنی کشمیری کا شعر ہے ؎

شد روشنم از شمع کہ در بزمِ حریفاں　　خاموش شدن مرگ بود اہلِ زباں را

مرزا نے غنی کا یہ شعر لفظ بہ لفظ ترجمہ کر کے یوں اپنا لیا ہے ؎

زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگ خاموشی　　یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیِ شمع

ظاہر ہے کہ مضمون غنی کا ہے اور مرزا اس کو کوئی ترقی نہیں دے سکے ہیں البتہ ترجمہ سے کمال استادی ظاہر ہے۔ میر کا شعر ہے ؎

ادھ جلا لالہ ساں رہا تو کیا　　داغ بھی ہو تو کوئی بالکل ہو

دیکھیے مرزا کے مندرجۂ ذیل شعر کا مضمون میر کے اس شعر سے کس قدر ہم آہنگ ہے ؎

جلتا ہے جی کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے　　اے ناتمامیِ نفسِ شعلہ بار حیف!

خواجہ میر درد کا ایک شعر ہے ؎

کی تو تھی تاثیر آہِ آتشیں نے اس پہ بھی　　جب تلک پہنچے ہی پہنچے راکھ کا یاں ڈھیر تھا

اور میر کہتا ہے ؎

بالیں پر میرے گھر سے تو آوے گا جب تلک　　کر جاؤں گا سفر ہی میں دنیا سے تب تلک

ان دو شعروں کے ساتھ میر حسن کا یہ شعر بھی دیکھیے ؎

جب تک آوے ہے آوے تو ہم تو　　مر چکے اشتیاق کے مارے

اب مرزا کا ہم مضمون شعر ملاحظہ ہو ؎

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن ۔۔۔ خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

ان چاروں شعروں کا مضمون ایک دوسرے سے الگ نہیں۔ البتہ ہر ایک نے اپنا اپنا انداز بیان اختیار کیا ہے ۔ شیخ علی حزیں کا یہ شعر دیکھئے ۔

گراں جاں تر ز شبنم نیست جسم ناتوان من ۔۔۔ اگر بے بود با من روے گرمی آفتابش را

مرزا کے ہاں یہ مضمون یوں بندھا ہے ۔

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم ۔۔۔ میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

حزیں نے آفتاب کو روئے محبوب سے استعارہ کیا ہے جس کی گرمی کے آگے اس کا جسمِ ناتواں شبنم کے قطرے سے زیادہ سخت جاں نہیں۔ مرزا نے اپنی ہستی کو قطرۂ شبنم اور دوست کی نظرِ عنایت کو آفتاب سے تشبیہ دی ہے۔ اس جدّت آفریں طرز ادا نے مضمون کو نہ صرف بلند بلکہ وجد انگیز بنا دیا ہے۔ شیخ ذوقؔ کا شعر ہے ۔

ہنگامہ گرم ہستیٔ ناپائیدار کا ۔۔۔ چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

مرزا فرماتے ہیں ۔

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل ۔۔۔ گرمیٔ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

صاحب "بحر الفصاحت" لکھتے ہیں کہ یہ سرقۂ ظاہر ہے۔ سرقہ ہو یا نہ ہو معلوم ہوتا ہے ایک نے دوسرے سے استفادہ ضرور کیا ہے لیکن چونکہ شیخ اور مرزا ہم عصر تھے یہ کہنا مشکل ہے کہ کس نے کس سے استفادہ کیا ہے۔

فارسی میں عزیزی کا شعر ہے ۔

خوشم بدردِ غریبی و بیکسی مُردن ۔۔۔ کہ نے غمیں شود از مُردنم نہ شاد کسے

اس کے ساتھ میرؔ کا انداز دیکھئے ۔

ہو گئی شہر شہر رسوائی ۔۔۔ اے مری موت تو بھی آ ئی

اس مضمون پر خواجہ آتشؔ کہتے ہیں ۔

ہنسنے والا نہیں ہے رونے پہ ۔۔۔ ہم کو غربت وطن سے بہتر ہے

مرزا نے مضمون کو وسعت بخشی ہے ۔

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دُور ۔۔۔ رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم

شیخ سعدی کا شعر ہے ؎

گفتہ بودم چو بیائی غمِ دل با تو بگویم ۔۔۔ چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی

کہتے ہیں میں دوست کے آنے پر اس کو اپنا غمِ دل سُنانا چاہتا تھا لیکن کیا کہوں جب وہ آتا ہے اسے دیکھ کر سارا غم بھول جاتا ہوں ۔

میرؔ دو شعروں میں اس طرح کہتے ہیں ۔ ؎

کہتے تو ہو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا ۔۔۔ سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

دل میں تھا اس سے ملئے تو کیا کیا نہ کہئے میرؔ ۔۔۔ پر جب ملے تو رہ گئے ناچار دیکھ کر

مصحفیؔ نے یہ مضمون یوں کہا ہے ؎

دل میں کہتے تھے ملے یار تو کچھ اس سے کہیں ۔۔۔ مل گیا وہ تو نہ اک حرف زباں سے نکلا

جرأتؔ کے ہاں بھی یہ مضمون دو شعروں میں دیکھئے ؎

اوسان نہیں رہتے جو دیکھے ان کو کہوں کچھ ۔۔۔ یوں کہنے کو کہتا ہوں کہ کیا کیا نہ کہوں گا

روز کہتے ہیں وہ آوے تو کہیں ہم جرأتؔ ۔۔۔ جب وہ آتا ہے تو اس وقت نہیں کہتے ہم

ذوقؔ ذرا پہلو بدل کر کہتے ہیں ؎

جو کچھ دل پر گزرتی ہے سُنائیں گے ہم اُس کو ۔۔۔ خدا جانے کہیں کیا ہم وہ اپنے دل میں کیا سمجھے

اس سلسلے میں حضرتِ ظفرؔ کا شعر بھی دیکھیے ۔ ان کا اندازِ بیان لُطف سے خالی نہیں ؎

کہتے تھے کہ وہ آئیں تو کچھ ان سے کہیں ہم ۔۔۔ لے حضرتِ دل اب کہو کیا کہتے ہو "لو آئے"

اب اخیر میں مرزاؔ کا اسلوبِ بیاں ملاحظہ فرمایئے ؎

آج ہم اپنی پریشانئ خاطر اُن سے ۔۔۔ کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

ہر شاعر کا شعر بجائے خود خوب ہے ۔ مرزا کے مصرعۂ ثانی میں ترکیب ایسی ہے کہ اس سے دو معنی برآمد ہوتے ہیں ۔

خواجہ آتشؔ کا شعر ہے ؎

ہوئی ہے مردمِ دنیا کی صورت سے یہ بیزاری ۔۔۔ گماں ہوتا ہے اپنے سایہ پر بھی مجھ کو دشمن کا

مرزا نے بھی یہ مضمون کہا ہے ؎

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں

مرزا کی تشبیہ مرکب ہے اور نادر بھی۔ شیخ محمد یعقوب صرفی کشمیری کا شعر ہے ؎

ز ضعفِ تن عجب حال است بیمارِ محبت را کہ نتواند کشید از ناتوانی بارِ صحت را

اور مقصدی کہتا ہے ؎

من جاں ز ناتوانی ہجراں نمے برم بسیار ناتواں شدہ ام جاں نمے برم

مُلا غنی کشمیری کے یہ دو شعر بھی دیکھئے ؎

نماند از ضعفِ تن آخر بجز نامے زمن باقی نگینے مے نماید گر نہند آئینہ در پیشم

جاں بلب از ضعف نتواند رسید ما بزورِ ناتوانی زندہ ایم

مرزا فرماتے ہیں ؎

ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

صرفی کہتے ہیں کہ بیمارِ محبت کا ضعف اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اس سے صحت کا بوجھ اٹھایا نہیں جا سکتا۔ مقصدی غم فراق میں بے حد ناتواں ہو گیا ہے اور جان بچا نہیں سکتا۔ غنی کے پہلے شعر کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کا ضعف اس درجہ کا ہے کہ اب اس کا وجود برائے نام ہے اور دوسرے کا یہ کہ ضعف کے مارے اس میں اتنی سکت نہیں کہ جان نکل سکے گویا وہ ناتوانی ہی کے سہارے زندہ ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ ضعف نے انھیں اس قدر بھینچ رکھا ہے کہ ناتوانی میں ان کا قد جھک بھی نہیں سکتا اور اس لیے ان کی ناتوانی کا اظہار نہیں ہو سکتا۔ پانچوں شعروں میں مقصودِ کلام ایک ہے یعنی بمبالغہ ناتوانی کا بیان۔ اس مضمون پر مومنؔ کا شعر بھی دیکھئے ؎

اب تو مر جانا بھی مشکل ہے ترے بیمار کو ضعف کے باعث کہاں دُنیا سے اُٹھا جائے ہے

ظاہر ہے کہ یہ مضمون دراصل صرفی کی قوتِ فکر کا نتیجہ ہے۔ باوجود اس کے ہر شعر بجائے خود خوب ہے۔ مومنؔ کا شعر معنی کے اعتبار سے غنی کے دوسرے شعر سے قریب تر ہے۔ اس نے بہ حیثیتِ مجموعی مضمون کو بلند کر دیا ہے۔

مرزا ؎ تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مُشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

یعنی خس کو اپنے وطن مطلب خارزار میں اذیت کا سامنا ہے اور وطن سے باہر بظاہر ایک بے مصرف چیز ہونے کی حیثیت میں ذلت اٹھانا پڑتی ہے۔ اگر یہ اپنے موزوں مقام یعنی گلخن میں ہوتا تو آگ میں گر کر آگ ہو جاتا اور روشنی کا جلوہ دکھا کر اپنا کمال ظاہر کرتا۔ مرزا اپنے آپ کو ایسے ہی خس کے ساتھ تشبیہ دے کر کہتے ہیں کہ ان کی بھی نہ تو وطن میں کچھ شان تھی اور نہ غربت میں کوئی قدر ہے۔ ان کے جوہر شاہدِ حقیقی سے اتحاد حاصل کرنے ہی پر کھل جاتے۔ اس کے ساتھ مومنؔ کا یہ شعر بھی دیکھئے جو اس سے کچھ ملتا جلتا ہے ؎

راحت وطن کی یاد کریں کیا سفر میں ہم
پاتے تھے چین کب غمِ دوری سے گھر میں ہم

مرزا وطن اور پردیس میں اپنی بے قدری کی دلیل پیش کرتے ہیں اور مومنؔ سفر میں وطن کی راحت اس لیے یاد نہیں کرتا کہ اسے گھر میں غمِ دوری کی وجہ سے کبھی چین نصیب نہ ہوا۔ مرزا کا شعر تکلف سے خالی نہیں لیکن مقابلۃً وسیع المعنیٰ ہے۔ مومنؔ کا شعر سلیس ہے ؎ شیخ ذوقؔ کا شعر ہے ؎

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

مرزا کہتے ہیں ؎

میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تو اور ایک وہ نشنیدن کہ کیا کہوں

دونوں شعر ہم مضمون ہیں یعنی دونوں میں تغافلِ محبوب کا بیان ہے مرزا کے دو مصرعوں میں طرزِ بیاں کا تقابل قابلِ دید ہے مگر ذوقؔ کا اندازِ بیان زیادہ صاف اور موثر ہے۔ اس سلسلے میں مومنؔ کا یہ شعر بھی دیکھئے ؎

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

قاسم بیگ قمی کا شعر ہے ؎

خدا بہ شکوہ زبانِ من آشنا نکند
من و شکایتِ آں بیوفا خدا نکند

مرزا کہتے ہیں ؎

ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ — ہے ہے خدا نہ کردہ تجھے بے وفا کہوں

قاسم بیگ کہتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ میں بے وفا محبوب کی شکایت کروں۔ مرزا فرماتے ہیں۔ میرا گمان محبوب کو بے وفا کہتا ہے اور میں اسے باوفا کہتا ہوں اس لیے محبوب سے کہتا ہے کہ بے وفائی نہ کر خدانخواستہ مجھے بھی بے وفا کہنا پڑے۔ مرزا نے پہلے مصرعے میں ایک اور گوشہ نکال کر مضمون کو وسعت دی ہے اور زور پیدا کیا ہے۔ امیر خسرو کا شعر ہے ؎

جاناں اگر شبیہت دہن بر دہن نہم — خود را بخواب ساز دگو کیں دہان کیست

اسی رنگ میں مرزا کا انداز دیکھیے ؎

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن — ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

مرزا سودا کے دو شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

یار آزردہ ہوا رات جو مینوشی میں — کیا ہوا ہم سے خدا جانے بے ہوشی میں

سودا کسی کو وہ تو ستاتے نہ بے سبب — کیا جانیئے کہ تجھ سے ہی کیا بات ہو گئی

اب مرزا کا شعر دیکھیے ؎

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں — ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

سودا کے شعروں کے مقابلے میں مرزا کا شعر عامیانہ مذاق کا ہے۔ مومن کا شعر ہے ؎

کرتے وفا امیدِ وفا پر تمام عمر — پر کیا کریں کہ اس کو سرِ امتحاں نہیں

اس کے ساتھ مرزا کا ہم قافیہ شعر دیکھیے ؎

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں — اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں

مومن کو اس بات کی شکایت ہے کہ محبوب اس کا امتحان لیتا ہی نہیں اور اس طرح وہ اس کی جفا سے بھی محروم ہے۔ محبوب امتحان لیتا تو وہ اس امید پر عمر بھر وفا کرتا کہ محبوب بھی وفا کرے گا مگر ہائے بدنصیبی! وہ امتحان لیتا ہی نہیں۔ مرزا کہتے ہیں کہ محبوب جفا کرتا ہے تو امتحان لینے کی غرض سے نہیں بلکہ صرف چھیڑ چھاڑ کی خاطر۔ اسے ہماری وفا پر اعتماد ہے۔ مومن کے شعر میں تغزل کا رنگ زیادہ شوخ ہے۔ وحشی کا شعر ہے ؎

کرشمہ گرم سوال است لب مکن رنجہ — کہ احتیاز بہ پرسیدن زبانی نیست

مرزا کہتے ہیں ؎

کس منہ سے شکر کیجئے اس لطفِ خاص کا　　پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

دونوں شعروں میں محبوب کی ایک ادایعنی کرشمہ یا لطفِ خاص کا ذکر کیا گیا ہے جس کے ذریعہ سے وہ زبانی پرسش کی بجائے عاشق کی خبر کا طالب رہا کرتا ہے۔ مضمون واحد ہے طرزِ ادا مختلف ہے۔ مرزا کا انداز زیادہ لطیف ہے۔ ذوق کا یہ شعر دیکھئے ؎

جو چشم کہ بے نم ہو وہ ہو کور تو بہتر　　جو دل کہ ہو بے داغ وہ جل جائے تو اچھا

اسی رنگ میں مرزا کے بھی دو شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم　　دل میں چھری چبھو مژہ گر خونچکاں نہیں

ہے ننگِ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو　　ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

ذوق کہتا ہے۔ جو آنکھ اشک بار نہ ہو اس کا اندھا ہو جانا ہی بہتر ہے اور جو دل داغدار نہیں اس کا جل جانا ہی اچھا ہے۔ مرزا کہتے ہیں۔ عشق میں دل کا دو نیم اور پلکوں کا خونچکاں ہونا ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو سینے کو خنجر سے چیر کر اور دل میں چھری بھونک کر یہ حالت پیدا کرنی چاہیئے کیوں کہ جس دل میں آتشِ محبت نہیں وہ سینے کے لیے باعثِ شرم ہے اور وہ سانس جو آگ نہ برسائے دل کے لیے باعثِ ندامت ہے۔ تینوں شعروں کا مضمون ایک ہے اور طرزِ ادا میں بھی کوئی خاص فرق نہیں۔ تینوں میں تقابل اور مساوات کی شان موجود ہے۔ مفتی صدرالدین خان آزردہ کا شعر ہے ؎

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں　　اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

مرزا کہتے ہیں ؎

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب　　سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

آزردہ کے نزدیک سودائے عشق میں بہر صورت فائدہ ہی فائدہ ہے یہاں تک کہ جان کھو بیٹھنا بھی کوئی نقصان نہیں۔ مرزا کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ اگر دیوانگی میں گھر خراب ہوتا ہے تو ہو جائے۔ اس میں میرا نقصان نہیں کیوں کہ گھر میں زیادہ سے زیادہ سو گز زمین ہو گی۔ اس کے بدلے بیاباں ملے گا۔

ممنونؔ کا ایک شعر ہے ؎

تفاوت قامتِ یار اور قیامت میں ہے کیا ممنونؔ وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

مرزا کے ہاں یہ مضمون اس طرح جلوہ گر ہے ؎

ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

مرزا کے اس شعر کو بھی سرقۂ جعفر ظاہر سے منسوب کیا گیا ہے۔ یہ بیان غالباً قیاس پر مبنی ہے البتہ دیگر بہت سے اشعار کی طرح ان دو شعروں میں مماثلت کے پیشِ نظر یہ کہنا شاید غلط نہ ہو گا کہ ممکن ہے کہ ممنونؔ کے شعر نے مرزا کو یہ مضمون سجھا دیا ہو گا۔ میرؔ کا شعر ہے ؎

کب تک آئینہ کو بیجا قبول مُنہ ترا اس طرف کبھی تو ہو

مرزا کا یہ پھڑکتا ہوا شعر اسی مضمون کا ترجمان ہے ؎

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری تجھے کس تمنّا سے ہم دیکھتے ہیں

امیر خسروؔ کا شعر ہے ؎

زہے عمرِ درازِ عاشقاں گر شبِ ہجراں حسابِ عمر گیرند

کمالؔ اسمٰعیل اصفہانی نے یہی مضمون اپنے ایک مطلع میں یوں باندھا ہے ؎

ز خضر عمر فزوں است عشق بازاں را اگر ز عمر شمارند روزِ ہجراں را[1]

مرزا کی زبانی بھی یہ مضمون سُنیے ؎

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

خسروؔ کہتا ہے کہ اگر شبِ ہجر کو بھی مدّتِ زندگی میں شمار کریں تو عاشقوں کی درازیٔ عمر کا کیا کہنا۔ کمالؔ کے نزدیک اگر روزِ ہجر کو عمر کا ایک حصّہ قرار دیا جائے تو عاشقوں کی عمر حضرتِ خضر کی عمر سے بھی زیادہ ہے۔ مرزا فرماتے ہیں کہ اگر ہجر کی طویل راتوں کو بھی حساب میں شمار کروں تو یہ بتانا مشکل ہو گا کہ اس جہانِ خراب میں کب سے رہتا آیا ہوں تینوں شعروں میں بنیادی خیال ایک ہی ہے یعنی مدّتِ ہجر کی درازی کے سبب سے عاشق کی عمر کا دراز ہونا۔ مضمون خسروؔ کے شعر سے ماخوذ ہے۔ کمالؔ نے

---

[1] بعض حضرات نے اس شعر کو کم گو کشمیری سے منسوب کیا ہے۔

شبِ ہجر کی جگہ روزِ ہجراں کہا ہے جس میں اتنا لطف نہیں۔ مرزا بیدل کا شعر ہے :-

آنجا جواب نامۂ عاشق تغافل است
بے ہودہ انتظارِ خبر می‌کشیم ما

مرزا اس مفہوم کو یوں ادا کرتے ہیں :-

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں وہ جو لکھیں گے جواب میں

حضرتِ شمس تبریزی کا شعر ہے :-

در شرابم چیزِ دیگر ریختی
بادہ تنہا نیست کیں آمیختی

مرزا کہتے ہیں :-

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

تبریزی کا شعر ایجاز و سلاست کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس نے "چیزِ دیگر" کہہ کر بلاغت کی شان بڑھا دی ہے۔ مرزا کہتے ہیں۔ آج خلافِ عادت جو اُن تک جام کی نوبت پہنچی ہے تو عجب نہیں کہ ساقی نے شراب میں زہر ملا دیا ہو۔ "زہر" کے بدلے "کچھ" کہہ کر کنایہ میں مطلب ادا کرنے سے لُطف پیدا ہوگیا ہے۔ دونوں شعر ہم مضمون ہیں اور بجائے خود خوب ہیں۔ مومن کا شعر ہے :-

چینِ جبیں کو دیکھ کے دل بستہ تر ہوا
کیسی کشودِ کار کشادِ نقاب میں

مرزا کا شعر دیکھئے :-

ہے نیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

مومن کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ محبوب بے نقاب ہوا تو میں نے اُسے چیں بہ جبیں پایا۔ اس سے میری مشکل اور بڑھ گئی۔ نقاب کے اُٹھ جانے سے دیکھئے میری کشائشِ کار کہاں ہوئی۔ مرزا صرف اتنا کہتے ہیں کہ محبوب کی نقاب پر جو شکن پڑی ہوئی ہے اس کو دیکھ کر عاشق یہ سمجھتا ہے کہ محبوب کی نیوری چڑھی ہوئی ہے یعنی کچھ خفا ہے۔ اس شعر میں کوئی خاص بات نہیں۔ اس کے مقابلے میں مومن کا شعر بہت بلیغ ہے۔

خواجہ آتش کا شعر ہے :-

صوفیوں کو وجد میں لاتا ہے پردہ ساز کا　　شبہ ہو جاتا ہے پردہ سے تری آواز کا

مرزا کہتے ہیں ؂

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع　　گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

آتش کہتا ہے۔ پردۂ ساز سے اہلِ حال اس طرح وجد میں آجاتے ہیں کہ گویا اس میں محبوب کی آواز سمائی ہوئی ہے۔ مرزا ذرا پہلو بدل کر کہتے ہیں کہ اگر یہ سچ ہے کہ ساز میں اسی کی صدا سمائی ہوئی ہے تو پھر سماں کے وقت جان کیوں فنا ہوتی ہے۔ عمر خیام کی ایک رباعی ہے ؂

گر گشتہ نہاں روئے بہ کس ننمائی　　گر در صورِ کون و مکاں پیدائی

ایں جلوہ گری بخویشتن بنمائی　　خود عینِ عیانی و خودی بینائی

مرزا کا یہ شعر اسی رباعی کے مضمون سے ہم آہنگ ہے ؂

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے　　حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

خواجہ میر دردؔ کا شعر ہے ؂

آئینۂ عدم ہی میں ہستی ہے جلوہ گر　　ہے موجزن تمام یہ دریا حباب میں

مرزا کہتے ہیں ؂

ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر　　یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

دونوں شعروں کا مضمون یہ ہے کہ ممکنات کی ہستی وجودِ واجب کے ضمن میں ہے۔ صرف اندازِ بیان کسی قدر متفاوت ہے۔ نظیر اکبرآبادی کا شعر ہے ؂

جہاں بھی خواب ہے اور ہم بھی خواب ہیں اے دل

عجیب بہار کا دیکھا ہے ہم نے خواب میں خواب

اس کے ساتھ مرزا کا شعر پڑھیے ؂

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود　　ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

ان دونوں شعروں میں بنیادی خیال ایک ہے۔ عیاثیؔ کا شعر ہے ؂

نامت ز رشک پیشِ کسے چوں نمے برم　　آیا سراغ از کہ کنم منزلِ ترا

مرزا کہتے ہیں ؎

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

دونوں شعروں کا مضمون واحد ہے۔ قباؔئی رشک کے مارے دوست کا نام کسی کے سامنے نہیں لیتا اور کہتا ہے کہ ایسی صورت حال میں اس کے گھر کا پتہ کس سے پوچھا جائے۔ مرزا کو بھی رشک اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ دوست کے گھر کا نام لیں لہٰذا ہر ایک سے پوچھتے ہیں کہ کدھر کو جائیں۔ جیسا کہ مولانا طباطبائی کہتے ہیں مرزا کے مصرعۂ ثانی میں "جاؤں کدھر کو میں" کا ٹکڑا دو معنی رکھتا ہے۔ اس کے لفظی مفہوم کے علاوہ حالتِ اضطراب و کثرتِ قلق میں "ارے کدھر جاؤں" سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں غم بہلے اور تسکین ہو۔ اس سے شعر میں لطافت پیدا ہو گئی ہے۔

مومنؔ کا مشہور شعر ہے ؎

اس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

مرزا کہتے ہیں ؎

جاتا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار اے کاش جانتا نہ تری رہ گزر کو میں

مومنؔ کہتا ہے کہ اُسے جہاں کہیں محبوب کے نقشِ قدم نظر آئے سجدہ کرتا گیا۔ یہ نقشِ قدم کوچۂ رقیب میں ملے۔ ناچار وہاں بھی سجدہ کرنا پڑا۔ کوچۂ رقیب میں سجدہ کرنا سخت ذلت کا باعث ہے مگر چوں کہ جذبۂ عشق میں خودداری کا خیال نہیں رہتا وہ اس میں عار نہیں سمجھتا۔ مرزا کہتے ہیں کہ چوں کہ معشوق کی آمد و رفت رقیب کے گھر میں تھی اس لیے اُن کو رقیب کے در پر ہزار دفعہ جانا پڑا اور ذلیل ہونا پڑا۔ خودداری کے خیال سے کہتے ہیں کاش وہ اس رہ گزر سے واقف نہ ہوتے اور بار بار یہ ذلت اُٹھانی نصیب نہ ہوتی۔ مومنؔ کا شعر بلند تر ہے۔ مرزا کا شعر بلاغت میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ شاہ مبارک آبروؔ کا شعر ہے ؎

دھمکاوتے ہو ہم کو عبث باندھ کر کمر کھولیں ابھی تو جائے میاں کا بھرم نکل [1]

---

[1] "خمخانۂ جاوید" مؤلفہ لالہ سری رام دہلوی میں یہ شعر یوں منقول ہے ؎

دھمکاوتے ہیں ہم کو کمر بند باندھ کر کھولیں ابھی تو جائے میاں کا بھرم نکل

مرزا کہتے ہیں ؎

ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے | کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

شعرا نے کمرِ معشوق کی باریکی کو بمبالغہ بیان کرتے ہوئے اسے عدم قرار دیا ہے۔ کمر باندھنا یا کسنا کسی مہم پر مستعد ہونے کو کہتے ہیں اور معشوق کی مہم یہ ہے کہ عاشق کو قتل کرے۔ عاشق معشوق کے کمر باندھنے یا کسنے کو اس واسطے خاطر میں نہیں لاتا کہ وہ جانتا ہے کہ اس کی حقیقت کچھ نہیں۔ دونوں شعروں کا مضمون ایک ہے۔ ثبات کا ایک شعر ہے ؎

باآں کہ ہمہ عمر نہ رفتم ز درِ او | پرسد ز من از ناز ترا خانہ کدام است

اس کے ساتھ مرزا کا یہ شعر دیکھیے ؎

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے | یہ جانتا اگر تو لُٹاتا نہ گھر کو میں

ثبات کہتا ہے کہ باوجود اس کے کہ میں نے دوست کے گھر کو اپنا ٹھکانا بنایا اور وہیں عمر بسر کی اس کی ستم ظریفی دیکھیے کہ وہ مجھ سے گھر کا پتہ پوچھ رہا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ جس کی خاطر میں نے سب کچھ لٹا دیا اور اپنے آپ کو تباہ کیا وہی مجھے بے ننگ و نام قرار دیتا ہے۔ مضمون ہم رنگ ہے لیکن بیان کا عالم کس قدر مختلف ہے۔ مومن کا شعر ہے ؎

بعدِ مدت اس کوُ سے یوں پھرے تنگ آکر | جائے جائے پھرتے ہیں پوچھتے مکاں اپنا

مرزا کہتے ہیں ؎

پھر بے خودی میں بھول گیا راہِ کوے یار | جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

مومن کہتا ہے کہ وہ محبوب کے کوچے سے مدت کے بعد اس حال میں نکلا کہ گھر کا راستہ ہی بھول گیا اور اب ہر ایک سے اپنے گھر کا پتہ دریافت کرتا پھرتا ہے۔ مرزا بے خودی کے عالم میں ایسے کھو گئے کہ انہیں اپنی خبر ہی نہ رہی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ حالت کوے یار میں ہوئی جہاں جاکر کوئی نہیں پلٹا۔ اس لیے وہاں کا راستہ بھول گئے ورنہ ایک دن وہاں اپنی خبر کو جاتے۔ "پھر" کا لفظ بتا رہا ہے کہ ان پر ایسی حالت پہلے بھی طاری ہوئی ہے۔ مرزا کے شعر میں "بے خودی" کے لفظ نے جان ڈال دی ہے۔ جو لطف اُن کی

اپنی خبر نہ ہونے میں ہے وہ موتمن کے مکان کے پوچھنے میں نہیں ۔
خضری لاری کا شعر ہے ؎

در بزم او کسے بہ بدی ہم نہ برد نام ہر چند گوش در پس دیوار داشتم

مرزا نے اس شعر کا مصرعۂ اوّل ترجمہ کر کے خفیف سے تصرف کے ساتھ اپنے ایک مشہور مطلع کا مصرعۂ اوّل قرار دیا ہے اور خضری کے شعر کے مصرعۂ دوم کے بدلے اپنا ایک چلتا ہوا مصرع لگا کر بات سے بات پیدا کی ہے ؎

ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

اب اس مضمون کے اور شاخسانے ملاحظہ ہوں جو دلچسپی سے خالی نہیں ۔
عہدی کا شعر ہے ؎

ازاں با محرماں پیوستہ در مجلس سخن گوید کہ می ترسد کسے با او حدیث درد من گوید

جیلی کا شعر ہے ؎

خاطرم جمع است از بدگوئی دشمن کہ باز گوش بر حرفش نمی دارد چو نام من برد

اس سلسلے میں میر درد کا شعر بھی سُنیئے ؎

یارو مرا شکوہ ہی بھلا کیجئے اس سے مذکور کسی طرح کا جا کیجئے اس سے

ان اشعار کے ساتھ موتمن کا یہ شعر بھی پڑھیئے ؎

ذکر کر بیٹھیں بُرائی ہی سے شاید میرا اب وہ اغیار کی صحبت سے حذر کرتا ہے

عہدی کے شعر کا مفہوم یہ ہے کہ دوست محرموں کے ساتھ ہمیشہ مجلس میں اس لیے محوِ گفتگو رہتا ہے کہ کسی کو اُسے میری درد بھری داستان سُنانے کا موقع نہ ملے ۔ جیلی کو اس بات کا اطمینان ہے کہ رقیب کی بدگوئی اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ جب دوست اس کا نام سُن لے گا وہ رقیب کی بات پر دھیان نہیں دے گا ۔
درد چاہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح دوست کے سامنے اُن کا ذکر کیا جائے خواہ وہ شکایت کے طور پر ہی ہو ۔ مرزا کہتے ہیں ۔ معشوق کو میرے نام سے اتنی نفرت ہے کہ اگر کوئی اس کے سامنے میرا ذکر بُرائی سے بھی کرے تو وہ خفا ہوتا ہے ۔ لہٰذا

جب رقیب اس کے سامنے میری بُرائی کرے گا تو عجب نہیں کہ اُسے رقیب سے بگاڑ ہو جائے اور وہ اس کی نظر سے گر جائے۔ مومن کہتا ہے کہ معشوق رقیبوں کی صحبت سے اس لیے گریز کرتا ہے کہ کہیں وہ میرا ذکر نہ کر بیٹھیں خواہ وہ بُرائی ہی سے کیوں نہ ہو۔ ان سب اشعار میں بنیادی خیال ایک ہے یعنی معشوق کو عاشق کے نام سے نفرت ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ کوئی اس کا ذکر تک کرے البتہ ایک دوسرے کے اندازِ بیان میں فرق ہے۔ مرزا کا شعر مقابلۃً میتی کے شعر سے زیادہ قریب نظر آتا ہے لیکن انہوں نے اپنی خاص طرزِ ادا سے مضمون کو بلند کر دیا ہے۔

ظہیر فاریابی کا شعر ہے ؎

صدمہ ہائے عشق را کے بوالہوس دارد قبول کے شناسد طفل قدرِ سیلیِ استاد را

مرزا نے بھی یہ مضمون کہا ہے لیکن ذرا پہلو بدل کر ؎

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں

ظہیر کہتا ہے جس طرح بچہ اُستاد کے تھپڑ کی قدر نہیں جانتا بوالہوس عشق کے صدمے قبول نہیں کرتا۔ مرزا کہتے ہیں کہ اہلِ نظر کے نزدیک حادثوں کا طوفان مکتب سے کم نہیں اور ان حادثوں کی موج کا تھپیڑا تادیب کے لیے اُستاد کے تھپڑ سے کم نہیں۔ مطلب یہ کہ وہ حوادث سے درسِ عبرت حاصل کرتے ہیں۔ ظہیر کے شعر میں تغزل کا رنگ ہے اور مرزا کے یہاں اخلاق کا۔ مومن کا شعر ہے ؎

نہ جاؤں گا کبھی جنت کو میں نہ جاؤں گا اگر نہ ہووے گا نقشہ تمہارے گھر کا سا

مرزا کہتے ہیں ؎

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

مومن اسی صورت میں بہشت کو جانے کے لیے تیار ہو گا جب وہ محبوب کے گھر کے مانند ہو گا۔ مرزا کے نزدیک اگرچہ بہشت جلوہ گری میں کوئے یار سے کچھ کم نہیں لیکن اس وجہ سے کہ وہاں عاشقوں کا اتنا ہجوم نہیں رہتا وہ کوئے یار کی برابری نہیں کر سکتا۔ دونوں شعروں میں خیال کی بنا مشترک ہے یعنی یہ کہ کوئے یار یا اس کا گھر بہشت

سے بہتر ہے۔ مرزا کے یہاں ترقی ہے۔ ملا فیاض لاہجی (قمی) کا شعر ہے ؎

ہر کس کہ زخمِ کاریٔ ما را نظارہ کرد — تا حشر دست و بازوئے او را دعا کند

میرؔ نے یہ مضمون یوں کہا ہے ؎

سراہا اُن نے تیرا ہاتھ جن نے دیکھا زخم — شہید ہوں میں ترے تیغ کے لگانے کا

مرزا کا مشہور شعر ہے ؎

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو — یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

ان اشعار کے ساتھ مومنؔ کا یہ شعر دیکھیے ؎

میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ — تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

ان اشعار میں خیال کی بنا ایک ہے۔ صرف اندازِ بیان کا فرق ہے۔ میرؔ کا شعر بجائے خود اچھا ہے لیکن غالباً فیاضؔ ہی کے شعر سے مستنبط ہے۔ مرزا کا شعر لاجواب ہے اور اس کی ساخت میں اُن کی جدت طرازِ طبیعت کو بڑا دخل ہے۔ گمان غالب ہے کہ میرؔ نے فیاضؔ کے چراغ سے چراغ جلایا ہے اور مرزا نے دونوں استادوں سے استفادہ کیا ہے۔ مرزا اپنا زخمِ جگر لوگوں سے اس واسطے چھپانا چاہتے ہیں کہ اسے دیکھ کر محبوب کی ناوک افگنی اور قدر اندازی کو نظر نہ لگے۔ مومنؔ چاہتا ہے کہ محبوب اس کے تغیرِ رنگ پہ نظر نہ ڈالے۔ اس کا یہ تغیرِ رنگ محبوب ہی کے حسن کا ایک کرشمہ ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اسے اپنے حسن کا احساس و اندازہ ہو جائے اور خود اپنی ہی نظر لگے۔ مرزا کا شعر صاف ہے اور اس کی خوبی بیان سے باہر ہے۔ مومنؔ کا شعر ایجاز و بلاغت کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ کرامیؔ کا شعر ہے ؎

غمگیں کسے نمی رود از کوئے مے کدہ — تا ہم پیالہ مہ عیدش نمی کنند

خفیف سے تصرف کے ساتھ مرزا کہتے ہیں ؎

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب — گدائے کوچۂ مے خانہ نامراد نہیں

ذوقؔ کا شعر ہے ؎

جو ہے سو پہلے میرے اٹھانے کی فکر میں — محفل میں اس کی کیا کوئی جو سر کا رنگ ہوں

یہ مضمون برنگِ دیگر مرزا کے یہاں یوں جلوہ گر ہے ؎

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے　　لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

دونوں شعر ہم مضمون ہیں مگر تمثیلی طرزِ ادا میں جو فرق ہے وہ ایک دوسرے کو اخذ و استفادہ سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ عمر خیامؔ کی ایک رباعی ہے ؎

در ہر دشتے کہ لالہ زارے بودست　　آں لالہ زخونِ شہریارے بودست
ہر برگ بنفشہ کز زمیں می روید　　خالے است کہ بر رخِ نگارے بودست

اس کے ساتھ خسروؔ کا شعر دیکھیے ؎

اے گل چو آمدی ز زمیں گو چگونہ اند　　آں روئے ہا کہ در تہِ گردِ فنا شدند

اس سلسلے میں بیدلؔ کا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو ؎

خلقے بہ عدم دودِ دل و داغِ جگر بُرد　　خاک ہمہ صرفِ گل و سنبل شدہ باشد

اب میرؔ کے یہ تین شعر دیکھیے ؎

ہیں مستحیل خاک سے اجزائے نوخطاں　　کیا سہل ہے زمیں سے نکلنا نبات کا
ہر قطعۂ چمن پر ٹک گاڑ کر نظر کر　　بگڑیں ہزار شکلیں تب پھول یہ بنائے
کو گل و لالہ کہاں سنبل سمن ہم نسترن　　خاک سے یکساں ہوئے ہیں ہائے کیا کیا آشنا

ان کے ساتھ سوداؔ کا یہ شعر بھی پڑھیے ؎

گئے جہان سے کیا کیا ستیزہ رو تہِ خاک　　کہ گل عدم سے جو آیا بہت لگار آیا[1]

شیخ ناسخؔ نے یوں کہا ہے ؎

ہو گئے دفن ہزاروں ہی گل اندام اس میں　　اس لیے خاک سے ہوتے ہیں گلستاں پیدا

اور نظیرؔ اکبر آبادی کا شعر ہے ؎

ہے کل یہ خطِ عارضِ خوبانِ سبز رنگ　　کہتی ہے آج خلق جنہیں سبزہ زار ہا

حسینوں کے خاک میں مل جانے کے بعد پھولوں کے نمودار ہونے کا یہ مضمون ارتقائی منزلیں طے کرتا ہوا آخر مرزا کے قلم سے بہترین صورت میں یوں شگوفہ ریز ہوا ہے ؎

---

[1] "کلیاتِ آتش" مرتبہ مولانا عبدالباری آسیؔ مرحوم میں یہ شعر اس طرح درج ہے ؎

گئے جہان سے کیا کیا ستیزہ جو تہِ خاک　　کہ گل جب آیا تو مجروح بے شمار آیا

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں   خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

میر حسن کا شعر ہے ؎

ہاتھ آیا بس اسی کے کچھ شبِ راحت کا لطف   جس نے اپنا ہاتھ تیری زلف کا شانہ کیا

مرزا کہتے ہیں ؎

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں

تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

ان دو شعروں کا موازنہ کرتے ہوئے ڈاکٹر رفیق حسین اپنی تصنیف "اردو غزل کی نشو و نما" میں فرماتے ہیں[۱]۔ "غالب کا شعر اپنی جگہ بے مثل ہے لیکن اہلِ محبت کے نزدیک میر حسن کا شعر فطرت سے قریب تر ہے۔ میر حسن نے یہ کہہ کر کہ جس نے اپنا ہاتھ تیری زلف کا شانہ کیا ایک تصویر کھینچ دی ہے جس میں حسن و عشق کے بیٹھے ہیں۔ راز و نیاز کی باتیں خاموشی کے عالم میں ہو رہی ہیں۔ امن و سکون، لطف و کیف اور مسرت و راحت کی گھڑیاں دست بستہ کھڑی ہیں۔ غالب کے شعر میں زلفوں کا کسی کے شانہ پر پریشاں ہونا گرم جوشی اور ترغیبِ جنسی کی علامت ہے۔ میر حسن کے شعر میں حیا سوزی نہیں ہے۔"

ہماری ناچیز رائے میں ڈاکٹر صاحب کا بیان نہ صرف حقیقت کے سراسر خلاف ہے بلکہ حیرت انگیز بھی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ میر حسن کے شعر میں "شبِ راحت کا لطف" اور "ہاتھ زلف کا شانہ کیا" کے مقابلے میں مرزا کے یہاں "راتیں اس کی ہیں" اور "بازو پر زلفیں پریشاں ہو گئیں" کے الفاظ کیوں کر گرم جوشی اور ترغیبِ جنسی کی علامت قرار دیے جا سکتے ہیں۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ اگر بقول ڈاکٹر صاحب میر حسن کے شعر میں حیا سوزی نہیں تو مرزا کے شعر میں یہ عیب کیوں ہے؟ "ہاتھ زلف کا شانہ کرنے" میں عاشق کے ارادی عمل کو دخل ہے جس کو گرم جوشی اور ترغیبِ جنسی کا محرک کہا جا سکتا ہے۔"

---

[۱] "اردو غزل کی نشو و نما"۔ از ڈاکٹر رفیق حسین۔ مطبوعہ اسرار کریمی پریس الہ آباد ص۔ ۲۳۷۔

"جس کے بازو پر زلفیں پریشاں ہوگئیں" عیزارادی صورتِ حال کی دلیل ہے۔ اسے محض عاشق کی خوش قسمتی کا ایک کرشمہ کہا جا سکتا ہے۔ عجب نہیں کہ مرزا نے میرحسن کے شعر سے استفادہ کیا ہو مگر اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ان کا شعر بے بدل اسلوبِ بیان کی بدولت ایک تازہ تخلیق سے کم نہیں۔ اکثر سخن فہموں نے بھی اسے مرزا کا ایک کارنامہ بتایا ہے اور ایک نشتر۔ میرحسن کا شعر اس کی گرد کو نہیں پہنچا۔

اس سلسلے میں حضرتِ آثر لکھنوی مرحوم کی تشریح دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے جو لفظ بہ لفظ حقیقت پر مبنی ہے۔ آپ لکھتے ہیں ؛ "شعر میں "نیند اس کی ہے" کا ٹکڑا بہت بلیغ اور اہم ہے۔ اس نے وصل کو خواہشاتِ جسمانی کی آسودگی سے مرتفع کر کے روحانیت میں متبدل کر دیا ورنہ وصل کا جو عام مفہوم ہے اس میں نیند کہاں ؟ بقولے ع یار کو میں نے مجھے یار نے سونے نہ دیا۔ "نیند اس کی ہے" اس ٹکڑے سے واضح ہوا کہ قربِ معشوق نے بے قراری و اضطراب کا خاتمہ کر دیا۔ یہ حالت اسی وقت تک تھی جب تک مطلوبہ شے دسترس سے باہر تھی۔ جب معشوق مل گیا تو سکونِ کامل میسّر ہوا۔ اب نیند اس کی نیند ہے۔ دماغ اس کا دماغ ہے۔ راتیں اس کی راتیں ہیں۔ خواب میں بھی اور عالمِ بیداری میں بھی۔ شعر کی غیر متحرک اور خاموش مصوری نے کہ معشوق کی زلفیں اس کے شانے پر بکھری ہوئی ہیں اور یہ محوِ خوابِ نوشیں ہے دو جسموں کا نہیں بلکہ دو روحوں کے مکمل باہمی جذب کا پیکر بنا دیا۔ عشق میں وصل کا یہی صحیح معیار ہے جس کو بوالہوسوں نے کیا سے کیا بنا دیا ہے۔" نعمت خان عالی کا شعر ہے ؎

آب و رنگِ گلستانِ عشق اکنوں از من است | عندلیباں ہرچہ می گویند مضمون از من است

مرزا کہتے ہیں ؎

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا | بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہوگئیں

یہ دو شعر ایک دوسرے سے تشابہ ضرور ہیں مگر نوعیتِ مضمون میں خفیف سا فرق ہے۔ عالی کا شعر زیادہ بلیغ ہے۔ مومن کا شعر ہے ؎

منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں | اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں

مرزا اس مضمون کو دوسرے پہلو سے باندھتے ہیں ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

مومن کے شعر میں تغزل کا رنگ ہے۔ کہتا ہے۔ میں دوست سے اس قدر دور رہا ہوں کہ جُدائی کا عادی ہوگیا ہوں۔ یہاں تک کہ اب مجھے اس کا غم نہیں رہا بلکہ اب میرے لیے وصل سے بڑھ کر کوئی ستم نہیں۔ مرزا مضمون کو فلسفیانہ رنگ میں پیش کر کے کہتے ہیں کہ جب انسان رنج کا عادی ہوجاتا ہے تو رنج رنج نہیں رہتا۔ مجھ پر اتنی مشکلیں پڑیں کہ میں ان کا خوگر ہوگیا ہوں۔ اس لیے اب مجھے مشکل نہیں معلوم ہوتی۔

مرزا سودا کے دو شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

اظہارِ سخن کیجیے کیا خاک زمین پر
ڈھونڈھے نہ ملا صاحبِ ادراک زمیں پر

دیکھی نہ ہنرمندی کی میں قدر جہاں میں
اے وائے بر آں دل جو طلب گارِ ہنر ہے

ان کے ساتھ مرزا کا یہ شعر دیکھیے ؎

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
کھُلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

میرؔ کا یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

پردہ چمک ہے اس کے رُخِ بے نقاب کی
حاجت ہے کیا نقاب میں اس کو نقاب کی

مرزا کہتے ہیں ؎

جب وہ جمالِ دل فروز صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں مُنہ چھپائے کیوں

میرؔ کہتا ہے کہ محبوب کے بے نقاب چہرے کے لیے اس کی چمک ہی پردہ ہے اس لیے اس نقاب کے ہوتے اُسے کسی اور نقاب کی ضرورت نہیں۔ مرزا کہتے ہیں جب مہرِ نیم روز کی طرح کثرتِ نور کے باعث کوئی شخص اس کے حسن کو دیکھنے کی تاب نہیں لاسکتا تو اُسے پردے میں مُنہ چھپانے کی کیا ضرورت ہے۔ دونوں شعر ہم مضمون ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میرؔ کا شعر سلیس اور صاف ہے اور مرزا نے شاعرانہ اندازِ تکلف کو مدِ نظر رکھا ہے
مومن نے بھی اس مضمون کا شعر کہا ہے مگر اس میں ایک اور گوشہ نکال لیا ہے ؎

کیا کیجیے کہ طاقتِ نظارہ ہی نہیں
جتنے وہ بے حجاب ہیں ہم شرمسار ہیں

یعنی محبوب گئے بے حجاب ہونے پر ہم اس کا حسن دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتے اس لیے ندامت دامن گیر ہے۔ مومن کا ایک اور شعر دیکھئے ؎

چھٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی ناصح یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے

مرزا کہتے ہیں ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

مومن محبت میں زندگی پاتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ محبت کی قید سے چھوٹ کر زندگی زندگی نہیں۔ محبت اگر قیدِ غم ہے تو یہی رازِ زندگی ہے۔ مرزا زندگی و غم کو لازم و ملزوم سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک قیدِ غم سے اگر رہائی مل سکتی ہے تو صرف قیدِ حیات ختم ہونے پر۔ مومن نے مضمون عاشقانہ رنگ میں کہا ہے اور مرزا نے فلسفیانہ انداز میں۔

مومن کا یہ شعر بھی دیکھئے ؎

گو آپ نے جواب بُرا ہی دیا ولے مجھ سے بیاں نہ کیجئے عدو کے پیام کو

اس کے ساتھ مرزا کا یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو

مومن کا مطلب یہ ہے کہ مانا تم نے دشمن کو بُرا ہی جواب دیا۔ میں اس کا پیغام ہی سُننا نہیں چاہتا۔ "مجھ سے بیاں نہ کیجئے" کہہ کر شدید نفرت کا اظہار کیا ہے۔ مرزا کہتے ہیں۔ ہر چند تم نے عدو کا ذکر شکایت ہی کے طور پر کیا مجھے یہ گلہ ہے کہ اس کا ذکر ہی کیوں کیا۔

مومن ہی کا ایک مشہور شعر ہے ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مرزا کہتے ہیں ؎

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

مومن کہتا ہے کہ جب اس کے پاس کوئی دوسرا نہیں ہوتا یعنی وہ خلوت میں ہوتا ہے تو صرف دوست ہی کا تصوّر اس کے پیشِ نظر رہتا ہے۔ مرزا خلوت کو بھی انجمن سے کم نہیں سمجھتے کیوں کہ خلوت میں انسان کے دل و دماغ میں خیالات و تصورات کا ہنگامہ

برابر رہتا ہے۔ مومن نے تصور کو دوست کے ساتھ وابستہ کر کے ایجاز و صفائی سے مضمون اس طرح ادا کیا ہے کہ اس کا جواب نہیں۔ مولانا حالی کہتے ہیں کہ مرزا خود اس شعر کے بیحد مدّاح تھے یہاں تک کہ وہ اپنا تمام دیوان اس کے عوض میں دینے کو تیار رہتے [1]
عرفی کا شعر ہے ؎

بہ کیشِ برہمناں آنکس از شہیداں ست | کہ در عبادتِ بُت روئے بر زمیں دارد

مرزا کہتے ہیں ؎

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے | مرے بُت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

دونوں شعر ہم آہنگ ہیں اگرچہ طرزِ ادا میں فرق ہے۔ مطلب یہ کہ عبادت کی اصلیت کا انحصار اس میں استقامت اور وفاداری پر ہے۔ مرزا نے اپنے مخصوص اندازِ بیان سے مضمون کو ترقی دی ہے۔ میر کا شعر ہے ؎

کون کہتا ہے نہ تم غیروں کی امداد کرو | ہم فراموش ہوؤں کو بھی کبھی یاد کرو

دردؔ نے یوں کہا ہے ؎

میں نہیں کہتا کہیں تم اور مت جایا کرو | بندہ پرور اس طرف کو بھی کبھو آیا کرو

مرزا جب یہی بات کہتے ہیں تو ان کا لہجہ پُر لطف ہوتا ہے ؎

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو | مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

جیسا کہ ایک سخن فہم فرماتے ہیں۔ میر کے شعر میں ایک طرح کی جھنجلاہٹ ہے۔ دردؔ کے شعر میں خوشامد ہے لیکن غالب نے یہ کہہ کر "تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو" اس طرح سے بات پھینکی ہے جس کا جواب نہیں۔ عرفی کا شعر ہے ؎

زفروغِ آفتابم بنود خبر کہ بے تو | چو دو زلفِ تست یکساں شب و روزم از سیاہی

---

[1] اس مضمون سے متعلق قبلہ پروفیسر ضیاء احمد صاحب کا یہ نوٹ قابلِ مطالعہ ہے "وہ کہتے ہیں کہ کوئی صاحبِ حال عالمِ استغراق میں بیٹھے تھے۔ کوئی فضولی بھی آ پہنچے اور پوچھنے لگے کہ حضرت اکیلے بیٹھے بیٹھے آپ کا دل نہیں گھبراتا؟ جواب دیا۔ میاں میں اکیلا کب تھا۔ تم آئے تو اکیلا ہو گیا۔ (طالب)

مرزا ذرا انداز بدل کر کہتے ہیں ؎

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا — وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیو نکر ہو

عرفی کہتا ہے کہ اسے دوست کی جدائی میں دن اور رات یکساں تاریک نظر آتے ہیں اور اسے سورج کی روشنی کا کچھ پتہ نہیں۔ مرزا روزِ سیاہ کی تاریکی کو بمبالغہ بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ایسی ہے کہ اس کے سامنے رات بھی دن معلوم ہوتی ہے وہ رات کو دن نہ کہے تو اور کیا کہے۔ نوعیتِ مضمون اور اندازِ بیان میں فرق نمایاں ہے۔ مومن کا شعر ہے ؎

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی — آشیاں اپنا ہوا برباد کیا

اس کے ساتھ مرزا کا بے مثال شعر دیکھیے ؎

قفس میں مجھ سے رُودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم — گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

نفسِ مضمون میں مماثلت ہونے کے باوجود ان دو شعروں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مومن نے حسبِ عادت اختصار سے کام لیا ہے۔ مرزا کا شعر ایک شاہ کار ہے اور ایک دفترِ معنی کا حامل جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ مومن کے شعر میں "برباد کیا" کا ٹکڑا اگرچہ لطف سے خالی نہیں لیکن اس میں وہ بات کہاں جو مرزا کے یہاں "آشیاں کیوں ہو" میں ہے۔

مومن کا یہ شعر بھی دیکھیے ؎

ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو — عذر کچھ چاہیے ستانے کو

مرزا کہتے ہیں ؎

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں — عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

مومن دوست سے کہتا ہے۔ تمہارا آزمانا دراصل ستانے کا ایک بہانہ ہے۔ مرزا کا مطلب یہ ہے کہ تم میرے دشمن کے معشوق بن کر میری محبت کو آزما رہے ہو۔ یہ آزمانا نہیں بلکہ ستانا ہے۔ مومن کے یہاں ایجاز و اختصار کے ساتھ مطلب ادا کیا گیا ہے۔ مرزا کے شعر میں مقابلتہً وسعتِ معنی زیادہ ہے۔

مومن کا ایک اور شعر ہے ؎

عاشق ہوتے ہیں آپ کہیں گو اسی پہ ہوں — شب حالِ غیر مجھ سے زیادہ خراب تھا

مرزا کہتے ہیں ؎

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر　　آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

مومن کہتا ہے کہ رقیبِ ہوس کار کارات کو مجھ سے زیادہ پریشان و تباہ حال ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بھی فی الحقیقت عاشق ہوا گو اسی پر ہوا ہو۔ اس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ عشق خانہ ویراں ساز ہے۔ مرزا کہتے ہیں معشوق خود کسی دوسرے شخص پر عاشق ہوا ہے۔ اس نے جو ستم ہم پر کیے ہیں اب وہی ستم اس کا محبوب بھی اس پر روا رکھے گا اور اس طرح اپنے جور و ستم کا بدلہ پائے گا۔ یہ دو شعر متشابہ ہیں مگر مرزا نے مضمون کا پہلو اس طرح بدل دیا ہے کہ اس سے ایک اور گوشہ نکل آیا ہے۔

عمر خیام کی ایک رباعی ہے ؎

مے خوردنِ من نہ از برائے طرب است　　نے بہر فساد و ترکِ دین و ادب است

خواہم کہ بہ بے خودی برآرم نفسے　　مے خوردن و مست بودنم زیں سبب است

حافظ نے اسی خیال کو اپنے انداز میں اس طرح ادا کیا ہے ؎

فرصت نگر کہ فتنہ چو در عالم اوفتاد　　عارف بجامِ مے زد و از غم کراں گرفت

کسی فارسی شاعر کا یہ شعر بھی اسی مضمون کا ہے ؎

مطلبم از مے پرستی نزد مائی ہا نبود　　یک دو ساغر آب دادم گریۂ مستانہ را

مرزا کے یہاں یہی مضمون یوں بندھا ہے ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو　　اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

فارسی کا شعر ہے ؎

سازِ ہستی غیر آہنگِ عدم چیزے نداشت　　ہر نوائے را کہ وا دیدم خموشی مے سرود

مرزا کہتے ہیں ؎

نشو و نما ہے اصل سے غالب فروع کو　　خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے

مطلب یہ ہے کہ ذاتِ الٰہی کا جلوۂ خاموش ہر چیز کی اصل (یعنی جڑ) ہے اور اسی سے سب کو نشو و نما حاصل ہوتی ہے جیسے درخت کی شاخیں سب جڑ سے پھوٹ کر نکلی ہیں لیکن

جڑ پکڑتی ہوئی ہے۔ اسی طرح جو بات ہے وہ خاموشی ہی سے نکلی ہے یعنی پہلے معنی اس کے ذہن میں آتے ہیں۔ اس کے بعد اس سے بات پیدا ہوتی ہے اور خود معنی پوشیدہ ہیں۔ فارسی شاعر نے سازِ ہستی و نوائے خاموشی کی تمثیل پیش کر کے مطلب ادا کیا ہے اور مرزا نے اصل و فروع اور خاموشی کی تمثیل سے۔

علامہ فیضی کا شعر ہے ؎

دریاب کہ ماندست زدل قطرۂ خونے آں قطرہ ہم از دستِ تو لبریز چکیدن

مرزا نے یہی مضمون یوں کہا ہے ؎

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

مرزا کا یہ مضمون غالباً فیضی کے شعر سے مستنبط ہے مگر انہوں نے اپنے اندازِ بیاں سے اسے ترقی دی ہے۔

مولانا جامی کا شعر ہے ؎

آسماں جامِ نگوں داں کز مئے عشرت تہی است
بادہ از جامِ نگوں جستن نشانِ ابلہی است[1]

اس کے ساتھ سودا کا ہم مضمون شعر دیکھیے:- ؎

نہیں میں طالبِ رزق آسمان سے کہ مجھے یقیں ہے کاسۂ وارُون میں کچھ نہیں ہوتا

ذوقؔ نے یہ مضمون یوں باندھا ہے ؎

مئے عشرت طلب کرتے تھے ناحق آسماں سے ہم کہ آخر جب اسے دیکھا فقط خالی سبو نکلا

مرزا کہتے ہیں ؎

مئے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

ظاہر ہے کہ جامی، سودا، ذوق اور مرزا چاروں نے ایک ہی مضمون پر طبع آزمائی کی ہے یعنی آسمان سے

---

[1] اس شعر کا مصرعۂ ثانی بعض نسخوں میں یوں درج ہے۔ ؏

جستن مے از تہی ساغر نشانِ ابلہی است (طالب)

عیش و عشرت کی توقع رکھنا بے معنی ہے۔ ہر ایک نے اپنے مخصوص رنگ میں اسے ادا کیا ہے۔ سوداؔ کے شعر میں اختصار و سلاست ہے۔ ذوقؔ کا شعر مقابلتہً پست درجے کا ہے۔ مرزا کا شعر جامیؔ کے شعر کا ہم پلہ ہے اگرچہ اس کے اثر سے بے نیاز معلوم نہیں ہوتا۔ مرزا نے ایک دو چار کہہ کر سات آسمانوں کی طرف جو اشارہ کیا ہے اس سے شعر میں لطف پیدا ہو گیا ہے۔

مرزا بیدلؔ کے یہ تین شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

۱۔ عالم فریب دیدۂ عاشق نمی شود	آئینۂ خیال تو صورت پرست نیست
۲۔ چوں نگہ در دیدۂ صیدِ الفت خویش دیس	ورنہ ایں بزم تحیّر حلقۂ دامے بیش نیست
۳۔ صورتِ وہمی بہ ہستی متہم داریم ما	چوں حباب آئینہ بر طاقِ عدم داریم ما

مرزا کا یہ شعر بھی اسی مفہوم کا ترجمان ہے ؎

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ	عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

حیدری تبریزی کا شعر ہے ؎

چو ریزم اشک از دل آہ دود آلود مے خیزد
بلے چوں آب بر آتش بریزی دود مے خیزد

اس کے ساتھ مرزا کا یہ شعر دیکھیے ؎

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا	ہر کوئی درماندگی میں نالہ سے ناچار ہے

حیدری نے دل سے آہ آتشیں کھینچنے پر آنسوؤں کے پانی کو اس پانی کے ساتھ تشبیہہ دی ہے جو آگ کو بجھا دیتا ہے اور اس سے دھواں اٹھتا ہے۔ مرزا نے مضمون دوسرے رخ سے کہا ہے اور اس میں مقابلتہً وسعت پیدا کی ہے۔ کہتے ہیں جس طرح آگ جیسی خاموش جلنے والی چیز سے پانی میں بجھتے وقت صدا اٹھتی ہے اسی طرح انسان درماندگی کی حالت میں نالہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے

میرؔ کا ایک شعر ہے ؎

وہ بھی جانے کہ لہو رو کے لکھا ہے مکتوب	ہم نے سرنامہ کیا ہے کاغذ افشانی کا

اور ذوقؔ کہتا ہے ؎

یہ چاہتا ہے شوق کہ قاصد بجائے مہر	آنکھ اپنی ہو لفافۂ خط پر لگی ہوئی

مرزا یوں کہتے ہیں ؂

آنکھ کی تصویر سرنامہ پہ کھینچی ہے کہ تا ‍ ‍ ‍ ‍ تجھ پہ کھل جائے کہ اس کو حسرتِ دیدار ہے

مضمون تیر سے مستعار لیا گیا ہے اور تینوں شعر ہم مضمون ہیں۔ ذوق کا شعر مرزا کے شعر کے مقابلہ میں بے ساختگی کے اعتبار سے بہتر ہے۔ اس میں حسرتِ دیدار کا علانیہ ذکر کرنے کی بجائے کنایہ میں مطلب ادا کرنے سے لطف پیدا ہو گیا ہے۔ مرزا سودا کا شعر ہے ؂

نہ پوچھ مجھ سے کدھر ہے خزاں کہاں ہے بہار

کہ بلبلِ قفسی کو ہے گل سے کیا سروکار

اور مرزا کہتے ہیں ؂

خزاں کیا، فصلِ گل کہتے ہیں کس کو، کوئی موسم ہو

وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

مرزا کا شعر سودا کے شعر کے مقابلے میں بہت بلند ہے اور اس کا اسلوبِ بیان بے بدل ہے۔ مصحفی کا ایک شعر ہے ؂

عاشق سے اپنے قطعِ مروّت نہ کیجیے ‍ ‍ ‍ ‍ یہ بھی نہ کیجیے جو محبت نہ کیجیے

ناسخ نے یہ مضمون بہتر انداز میں باندھا ہے ؂

رکھو کسی طرح تو سروکار میری جاں ‍ ‍ ‍ ‍ کرتے رہو جفا ہی وفا گر نہ ہو سکے۔

مرزا نے یہ بات اس طرح کہی ہے ؂

قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے ‍ ‍ ‍ ‍ کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

سودا کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے ؂

ساقی ہے اک تبسمِ گل موسمِ بہار ‍ ‍ ‍ ‍ ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں

اور مرزا کا شعر بھی اس کے ساتھ دیکھیے ؂

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام ‍ ‍ ‍ ‍ دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

ان دو شعروں کا مضمون مشترک ہے۔ انداز بیان میں فرق ہے۔ دونوں بجائے خود اچھے ہیں مگر سودا کا اسلوبِ بیان بہتر ہے۔

بیدل کا شعر ہے ؎

میردم از خویش دور اندیشۂ بر زآمدن
ہمچو عمرِ رفتہ یارب بر نہ گردانی مرا

مرزا کہتے ہیں ؎

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیٔ خیال
تا باز گشت سے نہ رہے مدّعا مجھے

بیدل کہتا ہے ۔ میں بے خود ہوا جاتا ہوں ۔ خدا سے دعا کرتا ہوں کہ ہوش میں آنے کا خیال پھر مجھ میں پیدا نہ ہو جس طرح عمرِ رفتہ پھر واپس نہیں آتی ۔ مرزا نے بھی یہی مضمون دوسرے رنگ میں ادا کیا ہے کہتے ہیں میدانِ خیال کو مستوں کی طرح طے کر رہا ہوں تا کہ مجھے اپنے آپ میں آنے کا ہوش نہ رہے ۔

ملا نظیری کا شعر ہے ؎

راز در سینۂ زرخ پردہ بر انداخت دریغ
حالِ ما شہرہ بانشار غزل ساخت دریغ

مرزا نے اسی مطلب کا یہ شعر کہا ہے ؎

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

ذوقی سمرقندی کہتا ہے ؎

کم تغافل ازیں بیشتر کہ مے ترسم
گماں برند کہ ایں بندہ بے خداوند است

اور مرزا کا شعر ہے ؎

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

ذوقی اور مرزا کے شعروں میں جو تھوڑا سا فرق ہے وہ یہ ہے کہ ذوقی محبوب کے تغافل کا ذکر کرتا ہے اور مرزا زندگی کی بدحالی کی طرف اشارہ کرتے ہیں ۔ باقی مضمون یکساں ہے ۔

فارسی میں کسی کا شعر ہے ؎

میردم زیں کوے واز رشکِ محبت میردم
بسکہ با من آشنا گشتی زغیرت میردم

کم و بیش یہی مضمون دوسرے الفاظ میں علامہ قمی کے مندرجہ ذیل شعر میں زیادہ صفائی سے پایا جاتا ہے ؎

زدل رشک آیدم گر گزرد در دل خیالِ تو
چساں بینم کہ افتد چشمِ غیرے بر جمالِ تو

اب مرزا کا شعر دیکھیے ؎

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

انتہائے رشک کا مضمون ہے جو تینوں شعروں میں بیان کیا گیا ہے۔ حالیؔ کے شعر میں لفظ "دل" کی تکرار کے باوجود اپنا اور غیر کا جو تقابل شعر میں دکھایا گیا ہے لطف سے خالی نہیں۔ مرزا کے شعر میں کوئی ایسی بات نہیں۔ اس سلسلے میں مومنؔ کا بھی ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

ان سے پری وش کو نہ دیکھے کوئی مجھ کو میری شرم نے رسوا کیا

مرزا اور مومنؔ کے ان دو شعروں کا موازنہ کرتے ہوئے مولانا معجزؔ سہسوانی فرماتے ہیں: "مرزا نے رشک کی حد یہ بتائی ہے کہ میں خود اپنے معشوق کو نہیں دیکھ سکتا۔ مومن خاں نے مبالغہ کیا ہے کہ جذبۂ رشک نے جب مجھ کو اس پر آمادہ کیا کہ میرے معشوق کو کوئی نہ دیکھے تو میں نے اپنی ذات کو بھی اس حکم میں شامل کیا اور مجھ کو اس کے دیکھنے میں شرم دامن گیر ہوئی لیکن اس اجتناب سے رازِ محبت افشا ہو گیا اور رسوائی حاصل ہوئی۔ یہ سلسلۂ خیال اور مقدماتِ فلسفیانہ مع نتائج عاشقانہ مومنؔ کے اندازِ تغزل کا خاصہ ہے۔" [1]

معجزؔ صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے اس حد تک درست ہے کہ مومنؔ نے مضمون کا رخ کسی قدر بدل کر اسے بلیغ کر دیا ہے اور اپنی جدت آفریں طرزِ ادا سے اس میں وہ رنگ بھر دیا ہے کہ یہ ایک تازہ تخلیق معلوم ہوتا ہے ورنہ یہ مضمون دراصل ثنائیؔ کی اس غزل کے ایک شعر کا عکسِ جمیل ہے جس پر مومنؔ نے تضمین کی ہے۔ وہ شعر یہ ہے [1]

میں زرشکِ عشق بجانم کہ سوئے او با شوق ایں چنیں نتوانم نظر کنم

مومنؔ کا ایک اور شعر دیکھیے ؎

یکسی تب ہو کہ ان لطفوں پہ گستاخی نہ ہو غیر ہم سا کب ہما ہر چند ہم سا ہو گیا

اس کے ساتھ مرزا کا یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

---

[1] "مومن و غالب" از مولانا حکیم سید اعجاز احمد معجزؔ سہسوانی مطبوعہ سرفراز پریس لکھنؤ ص ۵۶

غیر کو یا رب وہ کیوں کر منع گستاخی کرے — گر حیا بھی اس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے

مومن کے شعر کا مفہوم یہ ہے کہ رقیب اور مجھ پر معشوق کی نظر کرم یکساں ہے۔ اس لحاظ سے ہم دونوں برابر ہیں۔ لیکن یہ کب ہو سکتا ہے کہ رقیب مورد لطف و کرم ہو کر گستاخی نہ کرے۔ ہمارے سوا کسی کا ظرف نہیں کہ ایسی حالت میں اپنی حد سے آگے نہ بڑھے۔ اس لحاظ سے وہ ہماری برابری نہیں کر سکتا
مرزا کا مطلب یہ ہے کہ معشوق کو جب رقیب کے چھیڑنے سے حیا آتی ہے اور وہ اس حیا سے بھی شرماتا ہے تو خود رقیب سے بدرجۂ اولیٰ کیوں نہ شرمائے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اسے گستاخی سے منع نہیں کرتا۔
مومن کا شعر مرزا کے مقابلے میں بہت بلند ہے۔ مومن کا یہ شعر دیکھئے ؎

کل تم جو بزم غیر میں آنکھیں چرا گئے — کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

اس کے مقابل مرزا کا شعر ملاحظہ ہو ؎

گرچہ ہے طرز تغافل پردہ دار راز عشق — پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

مومن کا مطلب یہ ہے کہ معشوق نے بزم غیر میں اس سے اس لئے آنکھیں چرائیں کہ ان کے باہمی تعلقات کا حال دوسروں پر ظاہر نہ ہو لیکن وہ (مومن) اس درجہ خود رفتہ ہوا کہ اغیار اس راز عشق کو تاڑ گئے
مرزا کہتے ہیں ہم اس پر عاشق ہیں لیکن اس بات سے باخبر ہو کر بھی وہ عمداً بے خبری ظاہر کرتا ہے تاکہ ہمیں شرمندگی نہ ہو مگر ہم اس کے سامنے ایسے از خود رفتہ ہو جاتے ہیں کہ وہ سمجھ جاتا ہے کہ یہ راز افشا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دونوں شعر بجائے خود خوب ہیں۔ مومن کا انداز بیان یہاں بھی بہتر ہے۔
شرف قزوینی کا شعر ہے ؎

ہست صد منت بجاں از غیبت بد گو مرا
چوں بایں تقریب من آرد بیاد او مرا

اس کے ساتھ خواجہ میر درد کا شعر دیکھئے ؎

یارو مرا شکوہ ہی بھلا کیجئے اس سے — مذکور کسی طرح کا جا کیجئے اس سے

اب یہ مضمون مرزا کی زبانی سنیے ؎

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

تینوں شعر ہم مضمون ہیں یعنی عاشق اس بات کا متمنی ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس کا ذکر محبوب سے کیا جائے خواہ وہ برائی ہی سے یا شکایت کے طور پر ہی ہو۔ صرف انداز بیان میں فرق ہے۔ مرزا کا شعر مقابلتہً بہتر ہے۔ وقوعی تبریزی کا شعر ہے ؎

می نماید کہ سر عہد شکستن داری | خشم ایں بار تو چوں رنجش ہر بار تو نیست

مرزا نے یہ مضمون اختصار کے ساتھ زیادہ زوردار الفاظ میں ادا کیا ہے اگرچہ وہ وقوعی کے پہلے مصرع کا مفہوم اس میں شامل کرنے سے قاصر رہے ہیں ؎

بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں | پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

شبلی کا ایک اور شعر دیکھیے ؎

بسے خوشنود مے آید بسویم قاصدے گویا | کہ غیر از نامہ حرفے از زبان یار ہم دارد

مرزا نے کم و بیش اس کا ترجمہ یوں کیا ہے ؎

دیکھے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر | کچھ تو پیغام زبانی اور ہے

مضمون شبلی کی قوت فکر کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے لیکن مرزا نے یہ کہہ کر کہ خط دے کے نامہ بر منہ تکتا ہے ایسی بلاغت پیش کی ہے اور مضمون مقابلتہً اس طرح اختصار سے ادا کیا ہے کہ شبلی کے شعر کو اس سے کچھ نسبت نہیں رہی ہے۔ ایک فارسی رباعی ملاحظہ کیجیے ؎

گیرم کہ بہ تقویٰ و خردمندی و رائے | از دائرۂ شرع بروں ننہم پائے
با میل کہ طبیعت بکند چہ تواں کرد | عیبست کہ در من آفرید خدائے

اور خواجہ حافظ کا یہ شعر دیکھیے ؎

آئین تقوے مانیز دانیم | اما چہ چارہ با بخت گمراہ

اب اسی مضمون کا حامل مرزا کا یہ شعر پڑھیے ؎

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد | پر طبیعت ادھر نہیں آتی

میر حسن کا ایک شعر ہے ؎

کیا پوچھے ہے مجھ سے مری خاموشی کا باعث
کچھ تو سبب ایسا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

میر پہلے کہہ گئے ہیں ؎

ہمیں عشق میں میر چپ لگ گئی ہے — نہ شکر و شکایت نہ حرف و حکایت۔

اب مرزا کا شعر دیکھیے ؎

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

ان تینوں شعروں کا مفہوم ایک ہے ۔ صرف اندازِ بیان کا فرق ہے ۔

میر کا ایک اور شعر ہے ؎

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز — اسی خانہ خراب کی سی ہے

اس کے ساتھ مرزا کا ہم رنگ شعر ملاحظہ ہو ؎

کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں — میری آواز گر نہیں آتی

میر کے دو شعر دیکھیے ؎

۱؎ خدا جانے ہمیں اس بیخودی نے کس طرف پھینکا
کہ مدت ہو گئی ہم کھینچتے ہیں انتظار اپنا

۲؎ بیخودی لے گئی کہاں ہم کو — دیر سے انتظار ہے اپنا

مرزا کہتے ہیں ؎

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی

ان تینوں شعروں کے نفسِ مضمون میں کوئی فرق نہیں عجب نہیں کہ اور بعض اشعار کی طرح مرزا کے اس شعر کا محرک میر ہی کے یہ دو شعر ہوے ہوں ۔ مگر حق یہ ہے کہ ہر شعر بجاے خود خوب ہے ۔

مومن کا یہ مشہور شعر دیکھیے ؎

عمر تو ساری کٹی عشقِ بتاں میں مومن — آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

اس کے ساتھ مرزا کا یہ شعر دیکھیے ؎

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب — شرم تم کو مگر نہیں آتی

دونوں شعر اچھے ہیں البتہ مومن نے بہتر اندازِ بیان سے شعر کو بلند کر دیا ہے ۔

میر کا یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

بھاگے مری صورت سے وہ عاشق میں اس کی شکل پر

میں اس کا خواہاں یاں تلک وہ مجھ سے بیزار استغفر

کسی اور شاعر نے یہی مضمون یوں لکھا ہے ؂

ہم اس کو چاہیں وہ ہم سے خفا ہو　　　دلا یہ بھی تو قدرت ہے خدا کی

کسی فارسی شاعر نے یہ مضمون یوں باندھا ہے ؂

تو ملولی زما و ما مشتاق　　　دل بدل میرود چہ حال است ایں

مرزا کہتے ہیں ؂

ہم ہیں مشتاق اور وہ بے زار　　　یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

مندرجہ صدر چاروں شعر ہم مضمون ہیں۔ مرزا کا شعر قریب قریب فارسی شعر کا ترجمہ ہے۔ مصرعۂ ثانی میں باعتبار معنی جو خفیف سا فرق نظر آتا ہے قافیہ کے التزام اور ترجمے کی قید کی وجہ سے ہے۔ یہ دونوں شعر برجستگی کی عمدہ مثالیں ہیں۔ فارسی کا مشہور شعر ہے ؂

بہر رنگے کہ خواہی جامہ مے پوش　　　من انداز قدت را مے شناسم

مرزا کے مندرجہ ذیل شعر کو پڑھ کر اس فارسی شعر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے ؂

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے

ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

میر کا شعر ہے ؂

ہم نے بھی سیر کی تھی چمن کی پر اے نسیم　　　اٹھتے ہی آشیاں سے گرفتار ہو گئے

مرزا بھی کسی قدر اسی انداز میں کہتے ہیں ؂

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے　　　اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

استاد ذوق نے بھی یہ مضمون باندھا ہے لیکن مختلف تمثیل بیان کر کے ؂

قسمت تو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند

دو چار ہاتھ جبکہ لب بام رہ گیا

زلالی خوارزمی کا شعر ہے ؂

تنہا نصیبِ من غم و دردِ حبیب نیست

از ہیچ درد و غم دلِ ما بے نصیب نیست

مرزا کہتے ہیں ؂

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

زلالی نے صرف اتنا کہا ہے کہ دوست کے درد و غم کے علاوہ اس کے دل کو اور بھی غم ہیں۔ مرزا نے اس مضمون سے ایک اور مضمون نکالا ہے۔ کہتے ہیں دوست نے جو ظلم کیے ہیں اگر وہ وفا کر کے ان کی تلافی بھی کرے تو ان ظلموں کی تلافی کیوں کر ہو سکتی ہے جو دوست کے ظلم و ستم کے علاوہ ان پر ہوئے ہیں۔ مضمون میں ترقی ہے۔ میر کہہ گئے ہیں ؂

رہ گیا اس طرف کا خط لکھنا
ہاتھ جب تک مرا قلم نہ ہوا

مرزا نے یہ مضمون یوں باندھا ہے ؂

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

مضمون میں یکسانیت ہے۔ میر کے یہاں خط اور مرزا کے شعر میں حکایاتِ خونچکاں کے ذکر سے مطلب میں کوئی خاص فرق نہیں آتا۔ شیخ ناسخ کا شعر ہے ؂

شکل نظر نہیں پڑی آیا نہیں پیام بھی
برسوں ہوئے کہ ایک سی حالتِ چشم و گوش ہے

مرزا کے یہاں یہ مضمون یوں بندھا ہے ؂

نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

ناسخ کہتا ہے۔ آنکھ نے شکل نہیں دیکھی اور کان نے پیغام نہیں سنا۔ اس لیے مدت سے آنکھ جمال یار اور کان اس کے پیغام سے محروم ہونے کے باعث دونوں ایک ہی حال میں ہیں مرزا کہتے ہیں ایک وقت ایسا تھا کہ آنکھ کو نظارۂ جمال حاصل تھا تو کان کو اس پر رشک آتا تھا اور جب کان تک وصل کی خوش خبری پہنچ جاتی تو آنکھ کو اس پر رشک آتا تھا مگر اب وہ زمانہ گیا۔ اب نہ تو مژدۂ وصال ہی سنتے ہیں اور نہ جمالِ یار دیکھنا نصیب ہوتا ہے۔ اس لیے مدت سے آنکھ اور کان میں باہم صلح ہو چکی ہے بنیادی مضمون دونوں شعروں کا ایک ہے لیکن مرزا نے جس صفائی اور دلنشین انداز سے ادا کر کے اسے بلند کر دیا ہے ناسخ نہیں کر سکا ہے۔

رضی سمرقندی کا شعر ہے ؎

ستارہ ایست دُرِ گوشِ آں ہلال ابرو　　　　زروئے حسن بہ خورشید مے زند پہلو

مرزا کے اس شعر کا اس سے مقابلہ کیجئے ؎

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا　　　　کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

رضی نے ستارہ، ہلال اور خورشید وغیرہ کی رعایت کو مدنظر رکھتے ہوئے شعر کا حسن بڑھانے کی کوشش کی ہے اور معشوق کے کان کے موتی کو ستارہ قرار دے کر از روئے حسن اسے خورشید کے برابر بلکہ اس سے بھی بلند ظاہر کر دیا ہے۔ مرزا نے گوہر فروش کی خوش قسمتی پر اس لئے رشک کیا ہے کہ اس کے ہاتھوں بنا ہوا ہار معشوق کی گردن میں پڑا ہوا ہے۔ انہوں نے رشک سے متعلق کر کے مضمون کو ترقی دی ہے۔

میر کا یہ بلیغ شعر دیکھئے ؎

بزم کے عیشِ شب کا یاں دن ہوتے ہی یہ رنگ ہوا
شمع کی جاگہ دود تنک تھا خاکستر پروانہ تھا

اس کے ساتھ مرزا کے یہ چار قطعہ بند شعر دیکھئے ؎

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط　　　　دامانِ باغباں و کفِ گل فروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ　　　　یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھئے آکر تو بزم میں　　　　نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی　　　　اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

مرزا نے پہلے دو شعروں میں رات کے وقت بزم عیش و طرب کی چہل پہل کی تصویر کھینچ دی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس بزم کا فرش باغباں کا دامن اور گل فروش کا ہاتھ معلوم ہوتا تھا یعنی جلوۂ گل کی کثرت (مجمع حسیناں) سے وہاں خوب رونق تھی اور ساقی کے خرام ناز کے دیکھنے اور چنگ کی صدائے دلکش کے سننے سے جنت کا مزہ آرہا تھا۔ آخری دو شعروں میں رات کی خوشی اور چہل پہل کی بجائے اس اداسی اور سناٹے کے عالم کا نقشہ سامنے رکھا ہے جو صبح کے وقت نظر آتا ہے جب صرف ایک شمع باقی رہ گئی ہے جس کو صحبتِ شب کی جدائی کے داغ نے جلا کر خاموش کر دیا ہے۔

شعر میر کے متعلق حضرت عرشی فرماتے ہیں: "میر نے ایک ہی شعر میں اس کیفیت کو بیان

کیا ہے۔ ۱؎

یہ درست ہے۔ میر کا شعر واقعی ایجاز و اختصار کا ایک مرقع ہے مگر ساتھ ہی یہ ماننا پڑے گا کہ مرزا کا پیرایۂ بیان اگرچہ کسی قدر تفصیل کا حامل ہے پُردرد اور عبرتناک ہونے میں جواب نہیں رکھتا۔
خسرو کا ایک شعر ہے ؎

از وعدہ بر گزر کہ شکیبائم نماند — وز عشوہ بر شکن کہ گہ انتظار نیست

اس کے ساتھ مرزا کا یہ شعر دیکھئے جو مقابلتہً پست ہے ؎

آگہی جان کو قرار نہیں ہے — طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے

مومن کا شعر ہے ؎

پیشِ عدو سمجھ کے ذرا حال پوچھنا — قابو میں دل نہیں مرے بس میں زباں نہیں

اس کے ساتھ ذوق کا یہ شعر پڑھئے ؎

دیکھا آخر کو نہ پھوڑے کی طرح پھوٹ بہے
ہم بھرے بیٹھے تھے کیوں آپ نے چھیڑا ہم کو

اور مرزا کا شعر ملاحظہ کیجئے ؎

ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

تینوں شعر ہم مضمون ہیں البتہ طرزِ ادا میں فرق ہے۔ مومن کے شعر میں تغزل کا رنگ نمایاں ہے۔
عرفی کا ایک شعر ہے ؎

کہ لازم است بادہ کشیدن ز جامِ زر — مقصود تو گر اینست قصورِ سفال چیست

مرزا نے یہی مضمون اپنے اندازِ بیان میں ادا کر کے زیادہ زوردار اور دلکش بنا دیا ہے ؎

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا — ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

مرزا کا یہ شعر بہت مشہور ہے اور سخن فہموں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔ طرزِ ادا بھی خوب ہے مگر مضمون ان کا نہیں عرفی کا ہے۔ میر کا یہ شعر دیکھئے ؎

۱؎ دیوانِ غالب اردو۔ نسخۂ عرشی۔ صفحہ ۳۵۹۔

آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز — وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

مرزا نے بھی یہ مضمون خوب کہا ہے ؎

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے

وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

فسونی تبریزی کا شعر ہے ؎

بادچو میرسم آسودہ میشوم ازدرد — ندیدہ حال مرا وقتِ بے قراری حیف

مرزا نے بھی مضمون یوں باندھا ہے ؎

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منھ پر رونق

وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

یہ شعر مرزا کے بلکہ اردو زبان کے بہترین اشعار میں سے سمجھا جاتا ہے اور فی الواقع ہے بھی بہت خوب لیکن یہ کہنا غالباً بعید از حقیقت نہ ہوگا کہ اس میں بھی سوائے زبان و بندش کے مرزا کا کوئی حصہ نہیں۔

عرفی کا شعر ہے ؎

نالہ میکشم از دردِ تو گاہے لیکن — تا بلب میرسد از ضعف نفس میگردد

مرزا کہتے ہیں ؎

دل و جگر میں پرافشاں جو ایک موجۂ خوں ہے

ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اس کو دم آگے

عرفی نالہ کرتا ہے تو ضعف کے مارے یہ اس کے ہونٹوں تک آتے آتے سانس میں مبتدل ہو جاتا ہے مرزا کہتے ہیں غمِ عشق نے ان کے دل و جگر کو لہو کر دیا ہے۔ وہ اسے سانس سمجھے ہوئے تھے لیکن دراصل یہ ایک جوش زن موجِ خون ہے اور بس۔

میر معز فطرت کا شعر ہے ؎

ہر عضوِ من ز دستِ تو دارد شکایتے — چوں ارغنون لبا لبم از نالہ ہائے زار

جیسا کہ حضرت خوشی فرماتے ہیں اس بات کو مصحفی نے بڑی عمدہ تشبیہہ و تمثیل میں ادا کیا ہے ؎

شیشۂ مے کی طرح اے ساقی — چھیڑ مت ہم کو نہ بھرے بیٹھے ہیں

مرزا نے یہ مضمون یوں کہا ہے ؎

پُر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا   اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھیئے کیا ہوتا ہے

تینوں شعر بجائے خود خوب ہیں۔ مصحفی کے ہاں تشبیہہ مختلف ہے۔ مرزا یہ مضمون پہلے بھی کہہ چکے ہیں
مومن کا شعر ہے ؎

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی   آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

مرزا کہتے ہیں ؎

خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ   کہ بھلا چاہتے ہیں اور بُرا ہوتا ہے

دونوں استادوں کا مضمون یہ ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے ان کی خواہش کے برخلاف ہوتا ہے۔
مومن کہتا ہے۔ ہماری دعا کا اثر برعکس خواہش ہوتا ہے اس لیئے اب ہم کو ہجر یار کی دعا مانگنی
چاہیئے تاکہ وصل نصیب ہو۔ مرزا کا مطلب بھی بالفاظ دیگر یہی ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ بھلا چاہتے ہیں تو
بُرا ہوتا ہے اس لیئے اچھا ہوتا کہ وہ اپنے بدخواہ ہوتے کہ ان کا بھلا ہوتا۔ دونوں کے ادائے مطلب
میں فرق صرف یہ ہے کہ مومن نے اسے وصل دوست تک محدود رکھا ہے اور مرزا نے ہر بات
کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا ہے۔ مومن کے شعر میں تغزل اور شوخی کا رنگ نمایاں ہے۔ خواجہ بیاں
کا ایک شعر ہے ؎

عرش تک جاتی تھی اب لب تک بھی آسکتی نہیں

رحم آتا ہے بیاں اب مجھ کو اپنی آہ پر

مرزا کا ہم مضمون شعر ہے ؎

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب   لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

بیاں ضعف کے باعث آہ کا زور کم ہونے کا رونا روتے ہیں اور مرزا نالہ کی ناتوانی کا۔ بنیادی
طور پر دونوں کا مضمون ایک ہے لیکن طرز ادا اور بندش میں بیاں کا شعر مقابلتہً پست ہے۔
علاوہ ازیں اس میں "اب" کی تکرار کا عیب بھی ہے۔ میر کا شعر ہے ؎

کاشکے دل دو تو ہوتے عشق میں   ایک رکھتے ایک کھوتے عشق میں

مرزا کہتے ہیں ؎

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا — دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے

دونوں شعر بجائے خود خوب ہیں مگر مضمون میرؔ کے یہاں زیادہ اچھا بندھ گیا ہے۔

میرؔ کا ایک اور شعر دیکھئے ؎

اس کے ایفائے عہد تک نہ جیے — عمر نے ہم سے بے وفائی کی

اس کے ساتھ قائمؔ کا شعر ملاحظہ ہو ؎

بعد خط آنے کے اس کے تھا وفا کا احتمال — لیک واں تک عمر نے اپنی وفاداری نہ کی

مرزا نے اس مضمون کو یوں لکھا ہے ؎

آہی جاتا وہ راہ پر غالبؔ — کوئی دن اور بھی جیئے ہوتے

حسن بیگ رفیعؔ کا شعر ہے ؎

خوش دلم زیں کہ بادنامہ نویسم شب و روز — مقصدم نیست کہ مکتوب رسد یا نہ رسد

مرزا یہی بات یوں کہتے ہیں ؎

خط لکھیں گے گرچہ کچھ مطلب نہ ہو — ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

رفیعؔ کو دوست کے نام بار بار خط لکھنے میں مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اس کو اس بات سے غرض نہیں کہ خط دوست تک پہنچتا ہے یا نہیں۔ مرزا کو خط لکھنے میں اس واسطے لطف آتا ہے کہ اس میں محبوب کا نام آتا ہے۔ مضمون یکساں ہے۔ دونوں کو محبوب کے نام خط لکھنے میں خوشی حاصل ہوتی ہے۔

پنڈت چندر بھان برہمنؔ کا ایک شعر ہے ؎

ہمیشہ گرمیٔ میخانۂ جہاں باقیست — ہزار جام شکست و سبو نہ شد خالی

جیسا کہ بعض سخن فہموں کا خیال ہے عجب نہیں کہ مرزا کے مندرجہ ذیل شعر کا ماخذ برہمنؔ کا یہی شعر ہو ؎

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے — بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

مرزا نے برہمنؔ کے مقابلہ میں تمثیل کا جو انداز اختیار کیا ہے اس سے ان کا شعر بہت بلند ہو گیا ہے کہتے ہیں جس طرح میخانے میں جام و سبو کا شراب سے بھرا رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ میخانے میں کوئی میخوار نہیں ہے اسی طرح اہل ہمت کا نہ ہونا عالم کی آبادی کا سبب ہے۔ اگر وہ ہوتے تو ان کے جود و کرم کے سبب سے عالم کا آباد رہنا دشوار تھا جیسے جام و سبو کے جود و کرم سے میخانہ کا

بھرا رہنا دشوار ہے۔ بیدل کا شعر ہے ؎

زحیب ہر مژہ آغوش می چکد ایں جا | کہ جائے تو ہمہ در چشم دوستاں خالیست

مرزا کہتے ہیں ؎

گلشن کو تری صحبت از بسکہ خوش آئی ہے | ہر غنچہ کا گل ہونا آغوش کشائی ہے

دونوں شعروں کا مطلب یہ ہے کہ ہر کوئی دوست کی صحبت کا خواہاں ہے البتہ تمثیل ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ بیدل کے نزدیک ہر آنکھ اور مرزا کے خیال سے ہر غنچہ اس سے بغلگیر ہونے کے لیے آغوش کھولے ہوئے ہے۔ میر کا شعر ہے ؎

عشق کرتے ہیں اس پری رو سے | میر صاحب بھی کیا دوانے ہیں

مرزا یہی مضمون اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسدؔ | آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

استاد ذوق کا شعر ہے ؎

بات تو ہم نے بنائی تھی وہاں خوب مگر | تھی جو بگڑی ہوئی قسمت تو بنی خوب نہیں

مرزا کی زبانی بھی یہ مضمون سنیئے ؎

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے | کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

ذوق کہتا ہے۔ ہم نے ان کو باتوں میں خوب الجھایا مگر بد نصیبی سے پھر بھی ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوئے۔ مرزا فرماتے ہیں کہ وہ بڑا نکتہ چیں ہے۔ میں لاکھ بات بناؤں اور اپنا غم دل اس کو سنانا چاہوں وہ باتوں کے پھیر میں آنے والا نہیں۔ ایسی صورت میں مقصد برآری ہو تو کیوں کر ہو۔ ناکامیٔ محبت اور بات بنانے سے حصول مراد میں کامیاب نہ ہونے کا مضمون دونوں استادوں کے ہاں مشترک ہے مگر مرزا کے اسلوب بیان کے مقابلہ میں ذوق کا شعر پست ہے۔

سید انشار کا شعر ہے ؎

نزاکت اس گل رعنا کی دیکھیو انشار | نسیم صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا

مرزا کہتے ہیں ؎

اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا | ہاتھ آویں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے

دونوں شعر اپنی جگہ خوب ہیں اور جیسا کہ حضرت جوش ملسیانی فرماتے ہیں ان دو شعروں میں موازنہ کرنا مشکل ہے۔ فارسی میں کسی کا شعر ہے ؎

گفتی کہ بخواب اندر تسکیں دہمت امشب | اما تو کجا آئی چوں خواب نمے آید

مولانا جامی کے ہاں یہ مضمون یوں آیا ہے ؎

گفتی شبے بخوابِ تو آیم ولے چہ سود | چوں من بہ عمرِ خویش نہ دیدم کہ خواب چیست

اور مرزا نے یوں کہا ہے ؎

وہ آکے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے | ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے

تینوں شعر ہم مضمون ہیں۔ صرف اسلوب بیان کسی قدر مختلف ہے۔

علامہ فیضی کا یہ شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

نوشدارُوئے محبت را مپرس اجزا کہ چیست | سودۂ الماس در زہرِ ہلاہل میکنند

مرزا نے یہ مضمون اردو میں یوں منتقل کیا ہے ؎

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا | کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

میر کا یہ شعر دیکھئے ؎

اٹھتی نہیں پلک ہے تاہم فلک بھی آدیں | پھرتی ہیں وے نگاہیں پلکوں کے سائے سائے

مرزا کہتے ہیں ؎

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی | وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

ان دو شعروں کا موازنہ کرتے ہوئے پروفیسر سرور نے جو کچھ فرمایا ہے پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔ "دونوں شعر اپنی اپنی جگہ پر لاجواب ہیں مگر ان کا تاثر مختلف ہے پہلے شعر میں شہروادا کی معصوم کم نگاہی ہے۔ دوسرے میں ایک دانستہ کم آمیزی ہے۔ پہلے شعر میں اس محبوب کی تصویر ہے جو شرم سے آنکھیں چار نہیں کر سکتا۔ دوسرے میں دزدیدہ نگاہی، ایک شعوری کوشش ایک تجاہل عارفانہ، ایک سوچی سمجھی ظاہری بیگانگی ظاہر کی گئی ہے۔ غالب میر کی سی نشتریت نہیں پیدا کر سکتے تھے۔ میر کے یہاں گہرے اور پرخلوص جذبات کی چاندنی ہے۔ غالب کے یہاں چاندنی کے سائے اور سایوں کی چاندنی کی طرف اشارہ ہے۔"

مومن کا شعر ہے ؎

فریادِ بے گناہ کشی جا بجا کروں ۔۔۔ گر وہم جاں نثاریٔ پیغام بر نہ ہو

مرزا کہتے ہیں ؎

دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہیے ۔۔۔ ہوا رقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کہیے

مومن کا مطلب یہ ہے۔ اگر مجھے یہ وہم نہ ہو کہ نامہ بر نے خود ہی دوست پر عاشق ہو کر جاں نثاری کی ہے اور اس بات کا یقین ہو کہ دوست نے محض نامہ بر ہونے کی بنا پر اسے قتل کیا تو میں اس بیگناہ کے قتل کئے جانے پر بجا فریاد کروں اور اسے مجرم قرار دوں لیکن چونکہ حقیقت معلوم نہیں اس لئے میں خاموش ہوں مرزا کہتے ہیں۔ قاصد دوست کے حسن پہ فریفتہ ہو کر اگر ہمارا رقیب ہو گیا تو ہم کیا کہیں وہ بھی آخر انسان ہے۔ اس کو کیونکر قصوروار ٹھہرا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی نامہ بری کے خیال سے بھی ہمارا چپ رہنا ہی مناسب ہے۔ مومن نے ادائے مطلب میں کسی قدر مختلف پہلو اختیار کیا ہے اور اس کے شعر میں معنی آفرینی زیادہ پائی جاتی ہے۔

میلی کا شعر ہے ؎

سازد خموش تا منِ حسرت کشیدہ را ۔۔۔ گوید شنیدہ ام سخنِ ناشنیدہ را

میر نے یہ مضمون یوں کہا ہے ؎

جب دردِ دل کا کہنا میں دل میں ٹھانتا ہوں ۔۔۔ کہتا ہے بن سُنے ہی میں خوب جانتا ہوں

مرزا نے بھی خوب کہا ہے ؎

زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب ۔۔۔ کہ بن کہے ہی انہیں سب خبر ہے کیا کہیے

عرفی کا ایک شعر ہے جس کا حوالہ ہم اس سے پہلے مرزا کے ایک دوسرے ہم مضمون شعر کے ساتھ دے چکے ہیں ؎

از من بگیر عبرت و کسبِ ہنر مکن ۔۔۔ با بختِ خود عداوتِ بعنتِ آسماں مخواہ

مرزا نے بھی یہ مضمون اس شعر میں باندھا ہے ؎

حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کہیے ۔۔۔ ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہیے

بیدل کا شعر ہے ؎

مردہ ہم فکرِ قیامت دارد　　　آرمیدن چہ قدر دشوار است

اور خواجہ آتش کہتے ہیں ؎

زیرِ زمیں بھی چین کی صورت نہیں کوئی　　　آسودگانِ خاک کی مٹی خراب ہے

ذوق کا مشہور شعر بھی دیکھئے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے　　　مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

اب مرزا کا شعر ملاحظہ کیجئے ؎

وائے واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا　　　لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

چاروں شعر ہم مضمون ہیں۔ ذوق نے کنایہ میں اپنا مطلب بیان کیا ہے اور مرزا نے صراحت سے ذوق کے اندازِ بیان نے شعر کو زیادہ پُردرد اور بحیثیتِ مجموعی بہتر بنا دیا ہے کہتے ہیں مرزا خود ذوق کے اس شعر کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ مضمون کے اعتبار سے مرزا کا شعر بیدل کے شعر سے زیادہ قریب ہے

میر کا زبان زدِ عام شعر ہے ؎

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا　　　آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

مرزا نے بھی یہ مضمون اچھے اسلوب سے باندھا ہے ؎

رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو　　　ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے

یعنی آغازِ عشق ایسا سخت ہے تو انجام اس کا نہ جانے کیا ہوگا۔

شیخ ذوق کا یہ شعر دیکھئے ؎

ہم نے ان سے دوستی کی وہ ہیں کرتے دشمنی　　　دیکھو کیا چاہا تھا ہم نے اور واں کیا ہوگیا

اب مرزا کا شعر ملاحظہ ہو ؎

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے　　　کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

دونوں استادوں نے جذبۂ دل کی الٹی تاثیر اور مساعیٔ محبت کی ناکامی کا ذکر کیا ہے۔ مرزا کا مختلف

دونوں شعر بجائے خود اچھے ہیں۔

میر کے دو شعر دیکھئے ؎

۱۔　غیرت سے نام اس کا آیا نہیں زباں پر　　　آگے خدا کے جب ہم محوِ دعا ہوئے ہیں

مرے عشق ان کو ہے جو یار کو اپنے دمِ رفتن ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ کرتے نہیں غیرت سے خدا کے بھی حوالے [۵]

ان کے ساتھ مرزا کا شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالبؔ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

تینوں شعروں میں مرکزی خیال مشترک ہے جس کی بنا رشک ہے۔ میرؔ کا دوسرا شعر مرزا کے شعر سے زیادہ قریب ہے۔ وہ رشک کے باعث محبوب کو رخصت کرتے وقت خدا کے بھی حوالے نہیں کرتا۔ مرزا کے شعر کا بھی یہی مفہوم ہے البتہ انہوں نے اتنا اور اضافہ کیا ہے کہ ایسے محبوب کا رقیب کے ساتھ ہمسفر ہونا قیامت ہے۔

بیدلؔ کا شعر ہے ؎

دیدۂ را کہ بہ نظارۂ دل محرم نیست ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ مژہ برہم زدن از دستِ ندامت کم نیست

مرزا نے یہ مضمون یوں ادا کیا ہے ؎

زبسکہ مشقِ تماشہ جنوں علامت ہے ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ کشاد و بستِ مژہ سیلیِ ندامت ہے

بیدلؔ کا مطلب یہ ہے کہ جو آنکھیں دل کے نظارے سے واقف نہیں یعنی دل کے سوا کسی دوسری شے کے نظارے میں معروف ہیں ان کے لئے بار بار پلکوں کا مارنا باعثِ ندامت ہے۔ مرزا ہر وقت مصروفِ تماشہ رہنے کو جنوں کی علامت سمجھتے ہیں اور پلکوں کے کھلنے اور بند ہونے کو ندامت کا تھپڑ قرار دیتے ہیں۔ مرزا کا شعر بیدلؔ کے شعر کا ناقص ترجمہ ہے۔

نعیدی کا شعر ہے ؎

چہ بہرہ از گلِ رد ریش ہوس گداختہ را ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ بہار فیض نہ بخشد جنونِ ساختہ را

مرزا نے یہی مضمون یوں کہا ہے ؎

نامقابل دد عوئ عشق بے بنیاد ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ جنونِ ساختہ و فصلِ گل قیامت ہے

ان دو شعروں کا مضمون کم و بیش ایک ہے۔ مرزا نے اس میں وسعت پیدا کی ہے۔

جرأتؔ کا شعر ہے ؎

جو موت آئے تو پہچانے نہ مجھ کو ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ہوا ہوں ہجر میں لاغر یہاں تک

اور ناسخؔ کہتے ہیں ؎

---

[۵] اس کو عشق ہے۔ اس کو سلام ہے یا آفرین ہے۔ درویشوں کی اصطلاح۔ (پروفیسر ضیاء احمد)۔

لاغر ایسا ہوں کہ میں اگر ہوا سے اُڑ گیا — میرے پیکر میں ہے عالم کاغذِ تصویر کا

بادشاہ ظفر مرحوم کا انداز دیکھئے ۔ ؎

ناتوانی نے بچالی جان میری ہجر میں — کونے کونے ڈھونڈھتی پھرتی قضا تھی میں نہ تھا

اب مرزا کا شعر ملاحظہ کیجیے ؎

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے — میرا ذمہ دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

چاروں شاعروں کا مضمون ایک ہے یعنی لاغری کا بہ مبالغہ بیان ۔ ظفر کا شعر جرأت کے شعر سے قریب قریب ہم آغوش ہے ۔

میر کا شعر ہے ؎

ہوتا ہے یاں جہاں میں ہر روز و شب تماشا — دیکھو جو خوب تو ہے دنیا عجب تماشا

مرزا کہتے ہیں ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے — ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اگرچہ یہ عامۃ الورود مضمون ہے مرزا میر کے شعر سے متاثر ہوئے نظر آتے ہیں لیکن انہوں نے دنیا کو بازیچۂ اطفال کہہ کر مضمون کا رخ کسی قدر بدل دیا ہے جس سے تاثر بڑھ گیا ہے ۔

فارسی میں کسی کا شعر ہے ؎

فراقِ روئے تو در زندگی چہ حرف است ایں — تو خود در آئینہ بنگر کہ چیست حال مرا

مرزا کا مندرجۂ ذیل شعر اس سے بہت کچھ مناسبت رکھتا ہے ؎

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے — تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

عرفی کا شعر ہے ؎

بیار بادہ کہ جانم دمے ز نالہ برآید — ہزار زمزمہ از دل بہ یک پیالہ برآید

اس کے ساتھ مرزا کا یہ شعر دیکھئے ؎

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار — رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

مرزا کا شعر عرفی کے شعر سے پرتو پذیر معلوم ہوتا ہے مگر دونوں شعروں کا اندازِ بیان بجائے خود خوب ہے

مومن کا یہ شعر دیکھیے ؎

نہ مانوں گا نصیحت پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا ۔۔۔ کہ ہر ہر بات میں ناصح تمہارا نام لیتا تھا

اس کے ساتھ مرزا کا یہ شعر بھی ملاحظہ کیجئے ؎

نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا ۔۔۔ کیوں کر کہوں لو نام نہ اُن کا مرے آگے

مومن کہتا ہے کہ ناصح ترکِ عشق کی نصیحت کرتا تھا۔ میں اس کی نصیحت نہیں مانوں گا مگر اس کی باتیں سننے پر مجبور تھا کیونکہ وہ ہر بات میں محبوب کا نام لیتا تھا اور میں محظوظ ہوتا تھا۔ مرزا نے بھی ایسا ہی خیال ظاہر کیا ہے مگر دوسرے رخ سے کہتے ہیں کوئی معشوق کا نام لیتا ہے تو رشک کی وجہ سے مجھے ناگوار ہوتا ہے اس سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مجھے اس نام سے نفرت ہے۔ میں ایسے رشک سے باز آیا۔ اب کیوں کر کہوں کہ اس کا نام نہ لو۔ مومن ناصح کی ناقابلِ قبول نصیحت سننے پر اس لیئے مجبور ہے کہ وہ ہر بات میں محبوب کا نام لیتا تھا اور مرزا رشک کے مارے یہ گوارا نہیں کرتے کہ کوئی ان کے محبوب کا نام لے۔

دونوں شعر اپنی اپنی جگہ خوب ہیں۔ لالہ جگن ناتھ آزاد نے مومن کے شعر کا چربہ یوں اتارا ہے ؎

سنتا میں کہاں واعظِ ناداں کی نصیحت ۔۔۔ گر وعظ و نصیحت میں ترا نام نہ ہوتا

سحابی کی ایک رباعی ہے ؎

اے زاہد و عاشق از تو در نالہ و آہ ۔۔۔ نہ زہد تو ونہ دیگ ترا حال تباہ
کس نیست کہ جاں از تو سلامت برد ۔۔۔ آں را بہ تغافل کشی ایں را بہ نگاہ[1]

اس کے ساتھ امیر خسرو کا یہ شعر دیکھیئے ؎

گفتم بگو نہ مے کشی و زندہ میکنی ۔۔۔ از یک نگاہ کشت و نگاہِ دگر نہ کرد

اب مرزا کا انداز ملاحظہ ہو ؎

کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ ۔۔۔ کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

تینوں شاعروں کے ہاں مضمون میں کسی قدر کمی بیشی اور طرزِ ادا میں فرق ہونے کے باوجود مرکزی خیال مشترک ہے وہ یہ کہ محبوب کی ایک ہی نگاہ عاشق کو فنا کر دیتی ہے۔

مرزا بیدل کا شعر ہے ؎

---

[1] آتشکدہ آذر" میں اس رباعی کا مصرعہ سوم یوں درج ہے۔ ؏
"وہ کس نیست کہ از تو جاں تواند بردن" ۔ صفحہ ۲۰۶ ۔

چشم واکردن کفیلِ فرصتِ نظّارہ نیست — پرتوِ ایں شمع آغوشِ وداعِ محفل است

مرزا نے یہ مضمون یوں کہا ہے ؎

ناگہاے آگہی رنگِ تماشا باختن — چشمِ واگردیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

بیدل کا مطلب یہ ہے کہ آنکھ کا کھولنا اس بات کا کفیل نہیں کہ نظارے کی فرصت ملے - اس شمع نظارہ یعنی آنکھ کا پرتو ایک آغوش ہے جو محفل کو رخصت کرنے کے لئے کھول دی گئی ہے - مرزا کہتے ہیں کہ عالم بے ثبات پر آنکھ کھولنا گویا اس کو رخصت کرنے کے لیے آغوش کو کھولنا ہے - دونوں شعروں کا مطلب واحد ہے یعنی جلوۂ عالم کم ثبات ہے - مصحفی کا ایک شعر ہے ؎

پھٹ چکا جب سے گریباں تب سے — ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں

مرزا کہتے ہیں ؎

بیکاریٔ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل — جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

مصحفی گریبان پھٹ جانے کے بعد بیکار ہیں اور مرزا بیکاریٔ جنوں میں سر پیٹنے کا شغل اختیار کیے ہوئے ہیں - فارسی کا ایک مشہور شعر ہے ؎

تہی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبرِ کامل — کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ مے آرد سکندر را

یہ ایک عامۃ الورود مضمون ہے - مرزا مختصر طور پر یوں کہتے ہیں ؎

کیا کیا خضر نے سکندر سے — اب کسے رہنما کرے کوئی

میر کا شعر ہے ؎

گو کہ آتش زباں تھے پہلے میر — اب کی کہیے گئی وہ تب کی بات

مرزا کہتے ہیں ؎

سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی — یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

میر نے مضمون بے تکلّفی سے بیان کیا ہے - مرزا نے مصرعۂ ثانی میں "اب اس میں دم کیا ہے" کہہ کر شعر کو پُر اثر بنانے کی کوشش کی ہے -

مُلّا نظیری کا شعر ہے ؎

بزیرِ شاخِ گل افعی گزیدہ بلبل را — نواگرانِ نخوردہ گزند را چہ خبر

مولانا حالی اور مولانا طباطبائی لکھتے ہیں کہ مرزا کا ذہن مندرجۂ ذیل شعر میں تشبیہ کی طرف نظیری کے اسی شعر سے منتقل ہوا ہے۔

باغ پاکر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے

ممکن ہے ایسا ہو لیکن جیسا کہ مولانا آسی نے کہا ہے مرزا نے مضمون کو بالکل علیحدہ کر کے کہا ہے۔ یہ مضمون باندازِ دیگر ذوق کے یہاں بھی ملتا ہے ؎

سایۂ سروِ چمن تجھ بن ڈراتا ہے مجھے اژدہا بن کے شب اے رشکِ گلشن آب میں

عاقل خاں رازی کا شعر ہے ؎

مرا کرد رقیب از سرِ کوئے تو جدا اوّل ایں حادثہ بر آدم و حوا بگزشت

یہ مضمون مرزا کے یہاں زیادہ اچھا بندھا ہے ؎

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

شیفتہ مرحوم کا ایک شعر ہے ؎

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

اس کے ساتھ مرزا کا یہ شعر دیکھیے ؎

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

مضمون یکساں ہے مگر بیان کا عالم کسی قدر مختلف ہے۔ دونوں شعر بجائے خود خوب ہیں۔

فریدوں خراسانی کا شعر ہے ؎

از ضعفِ دل منال فریدوں زبیکسی میدار دل قوی کہ کسِ بیکساں خداست

مرزا کہتے ہیں ؎

بیدل نہ ہو بیگانگیٔ خلق سے غالب کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

مضمون ایک ہے یعنی بہرحال خدا پر بھروسہ کرنا۔ مرزا نے 'ضعفِ دل' کی بجائے 'بیگانگیٔ خلق' کہہ کر معنی میں کسی قدر وسعت پیدا کی ہے۔ مومن نے بھی اس سے ملتے جلتے مضمون کا ایک مقطع کہا ہے جس میں اس نے تغزل کا رنگ بھر دیا ہے اور مرزا کے مقطع سے بہتر ہے ؎

مومن۔ سہی بوسہ پاتے دیکھ کریں گے رعایت جو بے اور دل کا تو اپنا بھی خدا ہے

عرفی کا ایک بے مثل شعر ہے ؂

حلّہ ہا سوختہ اند اہلِ بہشت از غیرت ۔۔۔ تا شہیدانِ تو گلگوں کفنے ساختہ اند

مرزا نے بھی اس مضمون کا شعر کہا ہے اور حق یہ ہے کہ اس کا بھی جواب نہیں ؂

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں ۔۔۔ پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

یعنی شہیدوں کے خونچکاں کفن کی رنگینی و آرائش حور کو فریفتہ کرتی ہے ۔ خوب شعر کہا ہے ۔

فارسی کا ایک شعر ہے ؂

آوارہ گشتہ ام دگر امشب نظارہ را ۔۔۔ پیوند میکنم جگرِ پارہ پارہ را

مرزا نے یہ مضمون یوں ادا کیا ہے ؂

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو ۔۔۔ عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

فارسی شاعر کہتا ہے ۔ معشوق کے تیر نظر سے میرا جگر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا ۔ یہ ایک نظارہ تھا جس کا دیکھنا مجھے دوبارہ مطلوب ہے ۔ اس لیے ان ٹکڑوں کو جوڑ رہا ہوں تاکہ پھر یہ نظارہ دیکھنے کا موقع ملے ۔ مرزا کے شعر کا بھی یہی مفہوم ہے ۔ کہتے ہیں ۔ مدت ہوئی کہ مژگانِ یار کی دعوت کی تھی جس نے ٹکڑے اڑا دیئے ۔ اب پھر ان ٹکڑوں کو جمع کر رہا ہوں تاکہ ایک دفعہ پھر تیرِ مژگاں کو دعوت دوں ۔

مومن کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے ؂

رحم فلک اور میرے حال پر ۔۔۔ تو نے کرم اے ستم آرا کیا

اب مرزا کا یہ شعر پڑھئے ؂

نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لیے ۔۔۔ رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لیے

مومن کہتا ہے ۔ آسمان کو بھی جو ستم ڈھانے میں مشہور ہے میرے حال پر رحم آگیا ۔ اس کی وجہ یہ کہ محبوب نے مجھ پر اس سے زیادہ ستم کیے ہیں ۔ اس طرح محبوب کا ستم بھی میرے حق میں کرم ہو گیا ۔ مرزا نے اگرچہ مضمون کا رخ ذرا بدل دیا ہے لیکن اس کی ہم آہنگی میں شک نہیں ۔ کہتے ہیں ۔ دوست نے کوئی ستم اٹھا ہی نہ رکھا ۔ ہر طرز کا ستم مجھ پر ختم کیا ۔ اب آسمان کے لیے کوئی طرزِ ستم باقی نہیں رہی ۔ مجھ پر ستم کرنا چاہے تو نیا اندازِ ستم کہاں سے لائے ۔ اس لیے دوست کا ستم میری جان کے لیے امن کی خوش خبری ہے ۔ دونوں شعر بجائے خود خوب ہیں ۔ البتہ مومن کا شعر زیادہ پُرلطف ہے ۔

یہ مضمون شیفتہ نے بھی یوں لکھا ہے ؂

سب حوصلہ جو صرف ہوا جورِ یار کا | مجھ پر گلہ رہا ستمِ روزگار کا

اور خواجہ آتش تو پہلے کہہ گیے ہیں ؂

گردشِ چشمِ بتاں سے خاک میں ہم مل گیے | حوصلہ باقی فلک کو رہ گیا بیداد کا

شیفتہ کا ایک اور شعر دیکھیے ؂

ستم اگرچہ بنا ہر نازِ دلکشِ دوست | مگر کچھ اپنی بھی آہِ جگر فشاں کے لیے

اس کے ساتھ ذوق کا یہ شعر بھی پڑھیے ؂

نہ دل رہا نہ جگر دونوں جل کے خاک ہوئے | رہا ہے سینے میں کیا چشمِ خوں فشاں کے لیے

اب مرزا کا شعر ملاحظہ کیجیے ؂

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے | رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کے لیے

شیفتہ کہتا ہے ستم صرف محبوب کے نازہی کے لیے نہیں بنا ہے بلکہ کچھ میری جگر فشاں آہ کے لیے بھی۔ اور مرزا کا مطلب یہ ہے کہ اگر محبوب کی مژہ خون کی پیاسی ہے تو ہوا کرے۔ میں سارا خون اسی کو نہیں دے سکتا۔ میری مژہ بھی تو خون بہانا چاہتی ہے اس لیے کچھ اپنے لیے بھی رکھنا چاہتا ہوں۔ ذوق کا مضمون شیفتہ اور مرزا کے مضمون سے مختلف ہے۔ چشمِ خوں فشاں کے لیے دل یا جگر ہونا چاہیے تھا مگر دونوں جل کے خاک ہوئے۔ ایک بھی باقی نہ رہا۔

مومن کا شعر ہے ؂

کہاں وہ عیشِ اسیری کہاں وہ امنِ قفس | ہے بیمِ برقِ بلا، ورنہ آشیاں کے لیے

مرزا لکھتے ہیں ؂

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر | کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

مومن کو آشیاں کا برقِ بلا کی زد میں آنے کا خدشہ ہے۔ وہ اسیری کو عیش اور قفس کو جائے امن سمجھتا ہے اور ان کی تمنا کرتا ہے۔ مرزا نے اپنی ناکام کوشش کو بیان کرنے کے لیے بہت اچھی تمثیل دی ہے۔ کہتے ہیں جس طرح مرغِ اسیر قفس میں آشیاں بنانے کے لیے خس فراہم کرنے کی سعیِ لاحاصل کرے ویسے ہی میری کوشش بھی بے سود اور قابلِ رحم ہے۔ دونوں شعر پُر درد ہیں اور

مطلب میں تفاوت کے باوجود بجائے خود خوب ہیں ۔ خاقانی کا ایک شعر ہے ؎

زیں نام چو تر کنم زباں را
صد بوسہ دہد لبم زباں را

اس کے ساتھ جلال یزدی کا شعر دیکھیے ؎

از شوقِ تو صد بوسہ زنم بر دہنِ خویش
ہر گاہ کہ نامِ تو بر آید بہ زبانم

اسی رنگ میں طالب آملی کا بھی ایک شعر ہے ؎

چو نامِ او برم از ذوق مدّتے کلام
بجز لب و دہنِ خویشتن مکیدن نیست

ان اشعار کے ساتھ حزیں کا یہ شعر بھی ملاحظہ کیجیے ؎

تا نامِ شبِ وصلِ تو آید بزبانم
چوں شمع لبم مے مکد از ذوق دہن را

مرزا نے تجمل حسین خاں نواب فرخ آباد کی مدح میں اسی انداز کا ایک شعر کہا ہے ؎

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

مُلّا نظیری کا ایک اور شعر ہے ۔ ؎

مشاطہ را بگو کہ بر اسبابِ حسنِ دوست
چیزے فزوں کند کہ تماشا با رسید

اس کے مقابل مرزا کا یہ شعر رکھیے اور دیکھیے کہ نظیری کے شعر سے ہم آہنگی میں کس قدر قریب ہے ؎

زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے

"آسماں" کے قافیہ میں مومن کا مندرجہ ذیل شعر بھی لطف سے خالی نہیں جو اگرچہ ہم مضمون نہیں لیکن تخیل اور رنگِ تغزل کے لحاظ سے دل پسند ہے ؎

بلند ہووے اگر میرا کوئی شعلۂ آہ
تو ایک اور ہو خورشید آسماں کے لیے

عرصہ ہوا "آتشکدۂ آذر" میں عبدی کی ایک رباعی نظر سے گزری تھی اور وہ یہ ہے ؎

آمد رمضان نہ صاف داریم و نہ دُرد
وز چہرۂ من گرسنگی رنگ ببُرد

در خانۂ ما چو خوردنی چیزے نیست
اے روزہ برو ورنہ ترا خواہم خورد

مرزا نے خفیف سے تغیر کے ساتھ اردو میں اس کا چربہ یوں اتارا ہے ؎

افطارِ صوم کی اگر کچھ دستگاہ ہو
اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے

جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

مرزا کے فارسی کلام میں بھی بہت سے ایسے اشعار موجود ہیں جن کا مضمون فارسی کے پرانے اساتذہ کے خیالات سے پرتو پزیر دکھائی دیتا ہے یا بہت کچھ ملتا جلتا نظر آتا ہے۔ ایسے متشابہ یا ہم رنگ فارسی اشعار کا تذکرہ بجائے خود ایک مضمون چاہتا ہے۔ ہم اس کو بیاں بخوفِ طوالت قلم انداز کرتے ہیں۔ صرف نمونے کے طور پر دو تین شعر درج کیے جاتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے شیخ سعدی کا شعر ہے ؎

از ورطۂ ما خبر ندارد　　　آسودہ کہ بر کنارِ دریاست

خواجہ حافظ کہتے ہیں ؎

شبِ تاریک و بیم موج و گردابے چنیں ہائل　　　کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحل ہا

بقول مولانا آسی حافظ نے اس مضمون میں گویا اس کمی کو پورا کر دیا ہے جو شیخ کے بیان میں رہ گئی تھی۔ حافظ نے اپنے اندازِ بیان سے کرب ناک تاثر پیدا کیا ہے۔

اب مرزا کا شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز　　　گسستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خفتست است

مرزا نے اپنے شعر کے دوسرے مصرعے میں سبکسارانِ ساحل سے بے خبر ہونے کے بجائے ان مشکلات اور سختیوں کے بیان میں مزید اضافہ کیا ہے جن کا ذکر ان کے اور حافظ کے مصرعۂ اوّل میں کیا گیا ہے۔ اس سے شعر کے معنی میں وسعت اور زور پیدا ہو گیا ہے۔

خواجہ حافظ کے اور دو شعر مختلف بحروں میں ملاحظہ فرمائیے ؎

۱۔ حلّاج بر سرِ دار این نکتہ خوش سراید　　　از شافعی مپرسید امثالِ ایں مسائل

۲۔ رازِ درونِ پردہ ز رندانِ مست پرس　　　کیں حال نیست صوفیٔ عالی مقام را

مرزا نے ان ہی دو شعروں کے مضمون کو ایک کر کے دوسرے لباس میں اس طرح جلوہ گر کیا ہے ؎

آں رازکہ در سینہ نہاں است نہ وعظ است　　　بر دار تواں گفت بہ منبر نہ تواں گفت

اب تک مرزا اور دیگر شعراء کے کلام میں مماثلت اور ہم آہنگی کی نسبت جو کچھ لکھا گیا اس میں اکثر ان شعراء کے اشعار کا حوالہ دیا گیا ہے جن سے مرزا متاثر ہوئے یا جن سے انہوں نے بالواسطہ یا بلاواسطہ استفادہ کیا ہے۔ یا جن کے کلام کے ساتھ انہیں توارد ہوا ہے یا جن کے بعض مضامین انہوں نے

فارسی سے ترجمہ کرکے اپنے کلام میں داخل کئے ہیں۔ اِن میں سے اُن کے ہندی معصروں کے ایسے متشابہ یا ہم مضمون اشعار بھی شامل کیے گئے ہیں جن کے بارے میں یہ بتانا مشکل ہے کہ ان کے اشعار میں مرزا کے اشعار کے ساتھ یہ باہمی مماثلت یا ہم آہنگی محض اتّفاقی ہے یا ایک دوسرے سے استفادہ کرنے کا نتیجہ اگر استفادہ کرنے کا نتیجہ ہے تو معلوم نہیں کس نے کس سے استفادہ کیا ہے اور مضمون دراصل کس کی قوّتِ فکر کی پیداوار ہے۔ بہرکیف صورتِ حال کچھ بھی ہو ان کا موازنہ دلچسپی سے خالی نہیں۔
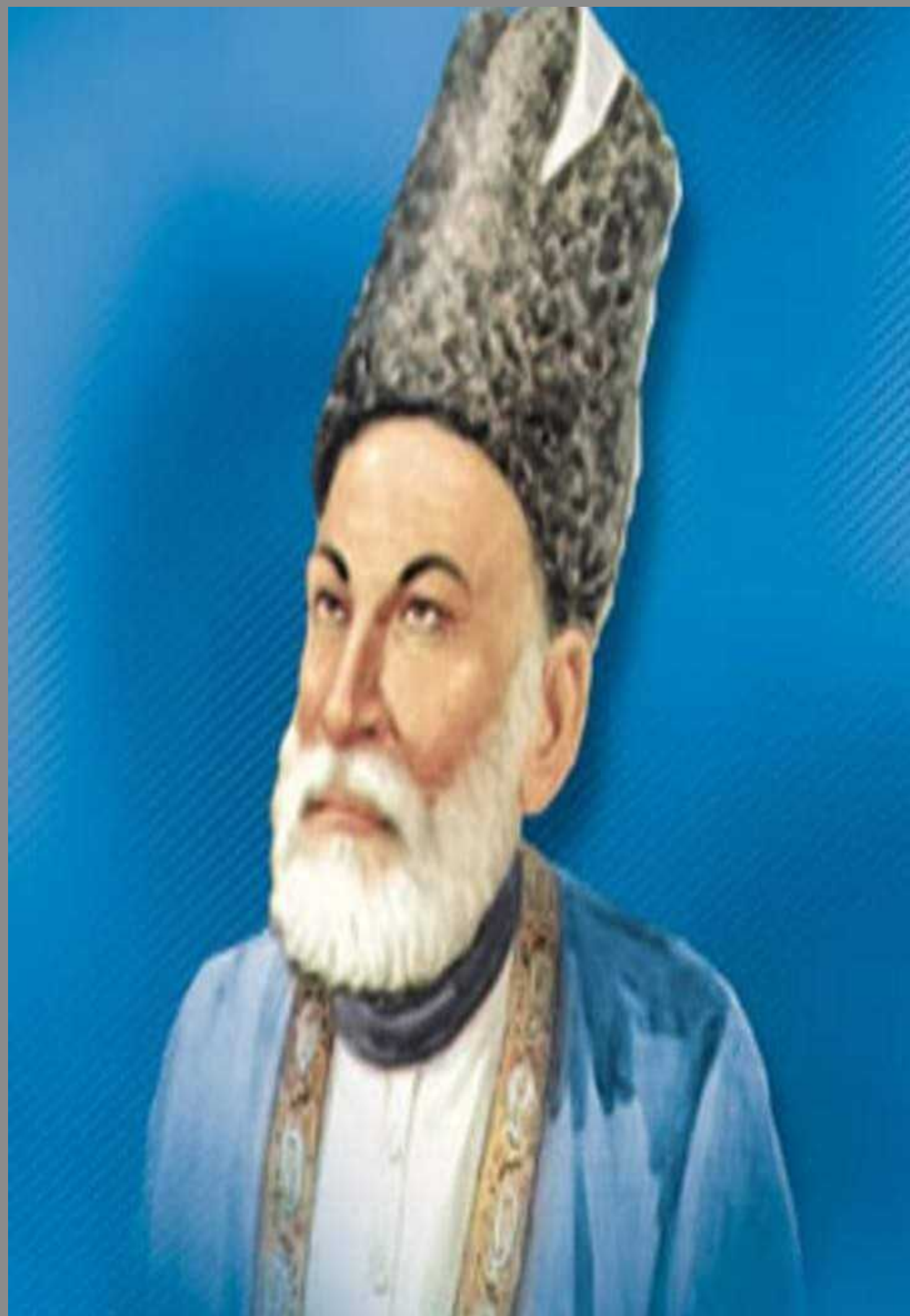
مرزا اور دیگر شعراء کے کلام میں مماثلت و ہم آہنگی

(حصہ ب)

مرزا کے کلام سے جن شاعروں نے خیالات و مضامین اخذ کیے ہیں یا استفادہ کیا ہے اس کے متعلق اتنا ہی لکھ دینا کافی ہے کہ ان کی تعداد بے انتہا ہے بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ملک کے وہ تمام شاعر جو شاعری میں نام پیدا کر گئے اور خاص کر غزل گوئی میں شہرہ آفاق ہوئے کم و بیش مرزا سے استفادہ کرنے میں بے نیاز نہیں رہے اور کسی نہ کسی صورت میں ان سے مستفیض ہوئے۔ اگر ان تمام اشعار کا جائزہ لینے کی کوشش کی جائے تو ہمارا مضمون یقیناً ایک ضخیم کتاب کی صورت اختیار کر لیگا۔ لہٰذا ہم فقط ان چند شعراء کے کلام سے صرف وہ اشعار پیش کرنے پر اکتفا کریں گے جو ہماری یادداشت میں محفوظ ہیں یا حال میں ہماری نظر سے گزرے ہیں یہ ہیں:۔ مرزا ؎

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

اسی زمین میں مرزا قوی لکھنوی کا ایک شعر ہے جو اس مضمون کا عکس ہے۔ جیسا کہ مولانا آسی مرحوم فرماتے ہیں مرزا قوی نے اس میں ایک نیا گوشہ نکال لیا ہے ؎

دل جگر دونوں نکل آئے ہیں پہلو توڑ کر
اللہ اللہ اشتیاق اک آنے والے تیر کا

مرزا ؎

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغِ جگر ہدیہ
مبارک باد اسد غمخوارِ جانِ دردمند آیا

تسنیم نے اس کی تقلید میں یوں کہا ہے ؎

جگر کو داغ، کلیجہ کو زخم، دل کو ملال
جنابِ عشق نے بھیجے ہیں ارمغاں کیا کیا

مرزا ؎

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیٔ چشمِ حسود تھا

مولانا آسی کا اسی مضمون کا شعر ہے ؎

در خورِ وحشت دلِ دامنِ صحرا نہ ہوا ۔۔۔ بجھ گئی قیس کی آتش کا گزارا نہ ہوا

مرزا ؎

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا ۔۔۔ آتشِ خاموش کے مانند گویا جل گیا

کسی کا یہ شعر بھی اسی مضمون کا ہے ؎

آتشِ الفت بھی کیا ہی آتشِ خاموش ہے ۔۔۔ اٹھ گئے دل کے دھوئیں لیکن دھواں کوئی نہیں

مرزا ؎

دل نہیں ورنہ دکھاتا تجھ کو داغوں کی بہار ۔۔۔ اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

مولانا آسی نے یہ مضمون بھی یوں باندھا ہے ؎

ہوتا جو دل تو تم کو دکھاتا میں داغِ دل ۔۔۔ اب کیا دکھاؤں اب تو نہ دل ہے نہ داغ ہے

مضمون مرزا کا ہے لیکن حق تو یہ ہے کہ مولانا نے بھی اچھے اسلوب سے باندھا ہے۔ شعر میں 'دل' اور 'داغ' کی تکرار نے بجائے بے لطفی کے زور پیدا کیا ہے۔

مرزا ؎

اے نو آموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند ۔۔۔ سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

مولانا آسی نے اس مضمون کا بھی ایک شعر کہا ہے جسے وہ خود مرزا کے اس شعر کی شرح قرار دیتے ہیں ؎

تنگ ہے عشق کی دشوار پسندی مجھ سے ۔۔۔ مجھ کو مرنا بھی شبِ ہجر میں آساں نکلا

مرزا ؎

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالب ۔۔۔ آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

جیسا کہ حضرت جوش ملسیانی کہتے ہیں حضرت نوح ناروی مرحوم کا ایک مقطع اسی مضمون کا ترجمان ہے ؎

جنہیں اے نوح ضبطِ غم نے دل میں روک رکھا تھا ۔۔۔ وہ اشک آنکھوں سے اب طوفان بن بن کر نکلتے ہیں

مرزا ؎

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب ۔۔۔ اس رہگزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

یہ مضمون مرزا داغ نے بھی باندھا ہے ؎

کبھی یہ دل تماشا گاہِ صد عیش و مسرت تھا — اب اس میں حسرت و یاس و تمنا سیر کرتے ہیں

مرزا ؎

احباب چارہ سازئ وحشت نہ کر سکے — زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

کسی اور شاعر نے ذرا پہلو بدل کر اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے ؎

مجھے اسیر کریں یا مری زباں کاٹیں — مرے خیال کو بیڑی پنہا نہیں سکتے

مرزا ؎

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا — وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

امیر مینائی نے یہ مضمون اپنے الفاظ میں اس طرح لکھا ہے ؎

بہارِ تازہ دل دیکھ اگر ذوقِ تماشا ہے — بہشت اک پھول مرجھایا ہوا ہے اس گلستاں کا

مرزا ؎

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے — دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

فراق گورکھپوری ؎

ابھی اک پرتوِ حسنِ خیالِ یار باقی ہے — ابھی آیا نہیں فرقت کو دردِ رائیگاں ہونا

"پہلا مصرعہ فراق کا نہیں ہے بلکہ یہ ادنیٰ تغیر غالب کا ہے لیکن فراق نے دوسرا مصرعہ لگا کر اسے بالکل اپنا بنا لیا ہے اور غالب سے زیادہ حسن کے ساتھ فرقت کو صرف اس لئے "دردِ رائیگاں" نہ کہہ سکنا کہ پرتوِ حسنِ خیالِ یار ہنوز باقی ہے نہایت لطیف بات ہے۔" [1]

مرزا ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

علامہ اقبال مرحوم نے یہ مضمون یوں باندھا ہے ؎

ہر گہر نے صدف کو توڑ دیا — تو ہی آمادۂ ظہور نہیں

مرزا نے ایک مسلسل غزل لکھی ہے جس میں انہوں نے اپنی اور محبوب کی حالت کا مقابلہ کیا ہے

---

[1] مولانا نیاز فتحپوری۔ "شاہکار" الہ آباد۔ فراق نمبر۔ صفحہ ۳۰۔

ایسی ہی ایک غزل ان کے شاگرد منشی غلام علی بسمل نے بھی لکھی ہے۔ دونوں کے ایک دو ملتے جلتے شعر ملاحظہ فرمائیے :-

مرزا ؎

واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام	گریہ سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

بسمل ؎

واں حنابندی عناں گیرِ خرامِ ناز تھی	یاں تنِ کاہیدہ غرقِ اشکِ خونِ ناب تھا

مرزا ؎

یاں سرِ پرشور بے خوابی سے تھا دیوار جو	واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا

بسمل ؎

یاں دلِ شوریدہ کو سر پھوڑنے کا تھا خیال	زیرِ سر واں غیر کا زانو برائے خواب تھا

مرزا ؎

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا	آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

حضرتِ جوشؔ ملسیانی نے یہی مضمون یوں لکھا ہے ؎

آدمی ہیں شمار سے باہر	قحط ہے پھر بھی آدمیت کا

مرزا ؎

وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھ کو	آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

کسی اور شاعر نے یہ خیال اس طرح ظاہر کیا ہے ؎

یہ شوق تھا کہ جنوں تھا کہ تیرے کوچے میں	ہزار بار گئے ہم ہزار بار آئے

مرزا ؎

عشرتِ قتلگہِ اہلِ تمنا مت پوچھ	عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

کسی اور شاعر نے یہ مضمون یوں کہا ہے ؎

آ تم سے بھی گلے مل لیں ہم آج اے حسرتؔ تو	ہے ہلالِ عید جو خنجر کفِ قاتل میں ہے
مرزا ؎ کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ	ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

یہ مضمون مختلف پہلوؤں سے کئی شاعروں نے باندھا ہے۔ ان کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔
میر تقی کہتا ہے ؎

میرے مرنے کا یقیں جب ان کو پورا ہو گیا
ہاتھ مل مل کر کہا افسوس یہ کیا ہو گیا

کسی اور شاعر نے کہا ہے ؎

پہلے تو اس نے قتل مجھے بے سبب کیا
اب ہاتھ مل رہا ہے کہ یہ کیا غضب کیا

نواب اس مضمون کو اس طرح ادا کرتا ہے ؎

قتل کے بعد رحم آتا ہے
یہ پنا ہے ہمارے قاتل کا

شرف کا انداز دیکھئے ؎

کرتے ہیں ہمیشہ مرے مرنے پہ تاسف
کیا ہاتھ سے کھو کر مجھے پچھتاتے ہیں معشوق

ان اشعار کے ساتھ جلال لکھنوی کا یہ شعر بھی ملاحظہ کیجیے ؎

دل مرا کر کے وہ پامال چلے جاتے ہیں
اور پھر دستِ تاسف بھی لے جاتے ہیں

ہر شعر بجائے خود خوب ہے لیکن مرزا کے نرالے اندازِ بیاں کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔
اس مضمون کا مفہوم دوسرے رخ سے علامہ اقبال مرحوم کے اس شعر میں بھی پایا جاتا ہے۔

آخر شبِ دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

حضرتِ فراق گورکھپوری نے اس مضمون سے ایک اور گوشہ نکال لیا ہے ؎

رشکِ صد لطف و کرم ہے یہ نیا رنگِ ستم
کچھ بھی جان سکے تیرا پشیماں ہونا

مرزا ؎

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

اُستاد ذوق نے یہ مضمون یوں کہا ہے ؎

ذکر کچھ چاکِ جگر سینے کا سن سن اپنے
دیکھ کر زخم کو میں دیکھوں ہوں ناخن اپنے[1]

مرزا ؎ حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

---

[1] اس شعر کا مصرعِ دوم کسی نسخے میں یوں درج ہے۔ ع
کر کے میں ضبط ہنسی دیکھوں ہوں ناخن اپنے

مرزا کا یہ مضمون مولانا حالی نے بھی ذیل کے دو شعروں میں باندھا ہے ؎

واعظ آتا ہے تو آنے دو اُسے — پر مزا آنے کا یاں کیا پائے گا
آئے گا اور ہم کو شرمائے گا مفت — اور خود شرمندہ ہو کر جائے گا

مولانا نے اپنے ایک اور شعر میں بھی یہ مضمون داخل کیا ہے ؎

دل کو سب باتوں کی ہے ناصح خبر — سمجھے سمجھائے کو ہم سمجھائیں کیا

معروف نے خفیف سی تبدیلی کے ساتھ اس طرح ادا کیا ہے ؎

چپ کرو بس ورنہ کچھ منہ سے سنوگے ناصحا — کچھ نہ سمجھاؤ مجھے حضرت سلامت ان دنوں

مرزا ؎

ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا — کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

حضرت نواز جعفری نے یہ مضمون اڑا لینے کی کوشش کی ہے ؎

ترے وعدے پر یقیں ہے کہ جو زندہ ہوں ابھی تک — میں کبھی کا مر نہ جاتا اگر اعتبار ہوتا

ظاہر ہے کہ نواز کا شعر مرزا کے شعر کا چربہ ہے اور کسی خاص خوبی کا حامل نہیں۔
یہ مضمون حضرتِ ظہیر دہلوی مرحوم نے بھی باندھا ہے لیکن نئے اسلوب اور وسعتِ معنی کے ساتھ ؎

غلط ہے شکوہ کہ وہ نہ آئے مجھے تو ہر طرح تھا آتی — اگر وہ آتے تو جی نہ جاتا کہ فرطِ شادی کا نتیجہ ہوتا

اس مضمون سے متعلق حضرتِ جگر مراد آبادی کا بھی ایک شعر ملاحظہ کیجیے جس کی بے تکلفی قابلِ داد ہے ؎

اس طرح خوش ہوں کسی کے وعدۂ فردا پہ میں — فی الحقیقت جیسے مجھ کو اعتبار آ ہی گیا

مرزا ؎

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو — یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

ایسا ہی ایک شعر مرزا داغ نے بھی کہا ہے ؎

جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چرائی — وہی تیر کیوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا

داغ کا شعر مرزا کے شعر کے برابر اثر آور نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دو شعروں کے

اظہارِ مطلب میں خفیف سا فرق ہے۔ مرزا تیر کا جگر کے اندر ہی رہنا پسند کرتے ہیں تاکہ اس کی لذتِ خلش سے محظوظ ہوں اور داغ اس بات کا متمنی ہے کہ تیرِ نظر جگر کے پار ہو جائے

مرزا ؎

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

ناظم کی زبانی بھی مختصر الفاظ میں یہ مضمون سُنیے ؎

سینہ آما جگہِ تیر نہ ہو کیا ممکن ‏ ‏ ‏ گر غمِ عشق نہ ہوگا غمِ دنیا ہوگا

یہ مضمون بھی مولانا حالی نے باندھا ہے مگر پہلو بدل کر ؎

دل نہ طاعت میں لگا تب تو لگایا غمِ عشق ‏ ‏ ‏ کسی دھندے میں تو آخر یہ لگایا جاتا

مرزا ؎

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بُری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

کسی کے اس شعر کا مفہوم بھی یہی ہے ؎

نہ پوچھ ہجر کی راتوں کی کاہشیں ہمدم ‏ ‏ ‏ وہ کیا جیے گا جسے موت بار بار آئے

ثابت[1] کشمیری کا یہ شعر بھی اسی مضمون کا ترجمان ہے ؎

ادھر کے ہو کے رہتے یا اُدھر کے فیصلہ ہوتا ‏ ‏ ‏ بُرا ہوتا ہے یوں مر مر کے جینا بیقراروں میں

مرزا ؎ نوازشہائے بیجا دیکھتا ہوں ‏ ‏ ‏ شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا

اس کے ساتھ مولوی عبدالحمید آزاد کا یہ شعر بھی دیکھیے ؎

تغافل ہائے بیجا دیکھتا ہوں ‏ ‏ ‏ گلہ آتا نہیں لیکن زباں پر

مرزا رقیب پر دوست کی مہربانیاں دیکھ کر اس سے ازراہِ محبت شکایت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انہیں یہ بُرا نہیں ماننا چاہیئے۔ آزاد دوست کے تغافل ہائے بیجا پر بھی گلہ

---

[1] پنڈت زندہ کول ثابت کشمیری مرحوم کشمیری زبان کے بلند پایہ شاعر تھے جن کو کشمیر میں سب سے پہلے ساہتیہ اکیڈمی دہلی کی طرف سے ان کی بہترین منظوم تصنیف "سمرن" کے لیے پانچ ہزار روپے کا نقد انعام عطا کیا گیا تھا۔ آپ ابتدا میں فارسی اور اردو میں بھی شعر کہتے تھے اور ثابت تخلص کرتے تھے۔ (طالب)

نہیں کرتا۔ یہ دو شعر باوجود تشابہ نظر آنے کے مختلف مضمونوں کے حامل ہیں۔

مرزا ۔ فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے　　ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا

حضرت ناطق نے بھی یہ مضمون اچھی طرح باندھا ہے ۔

اہلِ ہوس کو دردِ محبت کہاں نصیب　　یہ مال راہ میں نہیں ملتا پڑا ہوا

مرزا ۔ دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر　　ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

امیر کا ہم مضمون شعر ہے ۔

دریا سے موج، موج سے دریا نہیں الگ　　ہم سے جدا نہیں ہے خدا اور خدا سے ہم

یہ مضمون امراؤ مرزا انور دہلوی مرحوم کی زبانی بھی سنیئے ۔

جزوِ ذاتِ حبیب ہے عاشق　　لبِ دریا ہے نام ساحل کا

مرزا ۔ بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات　　عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

کسی کا یہ شعر بھی یہی مضمون پیش کرتا ہے ۔

غمزہ نے تیغ سنبھالی تو ادا نے برچھی　　ان کا ہر ناز مری جاں کا خواہاں نکلا

مرزا ۔　　نہ مارا جان کر بے جرم قاتل تیری گردن پر

رہا مانندِ خونِ بے گنہ حق آشنائی کا

جیسا کہ حضرت جوش ملسیانی کہتے ہیں امیر مینائی نے بھی یہ مضمون باندھا ہے مگر مرزا سے بالکل الگ ہو کر ۔

بات رکھ لی مری قاتل نے گنہگاروں میں　　اس گنہ پر مجھے مارا کہ گنہگار نہ تھا

مرزا کہتے ہیں بے گناہ سمجھ کر نہ مارا اور امیر کہتا ہے بے گناہ سمجھ کر مارا۔ دونوں شعر اپنی اپنی جگہ خوب ہیں۔

مرزا ۔　　وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے

چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

اس کے پہلو بہ پہلو علامہ اقبال کا یہ شعر دیکھئے ۔

حسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے　　انسان میں سخن ہے غنچہ میں وہ چٹک ہے

مرزا ؎ لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

اس میدانِ طبع آزمائی میں مولانا حسرتؔ موہانی کی جولانی بھی قابلِ دید ہے ؎

وہ خوابِ ناز میں تھے اور نہ تھے اے شوقِ پابوسی
نہ سمجھی پستیٔ ہمت تری اس لطفِ ایما کو

مرزا ؎ سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا
مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

یہ مضمون کسی ہندی شاعر نے اپنی زبان کے قالب میں یوں ڈھالا ہے ؎

سائیں انکھیاں پھیریاں تو بیری تکلک جہاں ملک اک جھوٹا مہر کا تو لاکھوں کریں سلام

مرزا ؎ وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا

حضرت آغا شاعرؔ دہلوی مرحوم نے اس مضمون کو اپنے اندازِ بیاں سے زیادہ جان دار بنا دیا ہے ؎

حشر میں انصاف ہوگا بس یہی سنتے رہو کچھ یہاں ہوتا رہا ہے کچھ وہاں ہو جائے گا

مرزا ؎ جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

شمشادؔ نے اس کا چربہ یوں اتارا ہے ؎

بیچ میں ڈالتے ہو غیروں کو یہ تو جھگڑا ہوا گلہ نہ ہوا

مرزا ؎ جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

حضرت اکبرؔ الہ آبادی مرحوم نے بھی یہ مضمون باندھا ہے لیکن مرزا کی طرزِ ادا سے محروم ہے ؎

انہیں نے عطا کی تھی یہ جانِ حزیں ہوا خوب انہیں پر فدا ہو گئی

ذرا انداز بدل کر دوسرے شاعر یوں کہتے ہیں ؎

مرنے میں اس خیال سے تسکین ہے بہت دی میری جان، ہے کہ تھی جس کی دی ہوئی

مرزا ؎ غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

امیر نے یہ مضمون یوں باندھا ہے ؎

کیا دل گرفتگی میں مزا سیرِ باغ کا — گلگشت کی نہ دے مجھے تکلیف ہم صفیر

اور داغ کا انداز یہ ہے ؎

کیا سمائی ہوئی ہے بو مجھ کو — نکہتِ گل ہے ناگوارِ دماغ

حضرتِ جگر مرادآبادی نے بھی اسی رنگ میں ایک مطلع کہا ہے اور خوب کہا ہے ؎

نہ چھیڑ ان کے تصور میں اے بہار مجھے — کہ بوئے گل بھی ہے اس وقت ناگوار مجھے

مرزا ؎ فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسدؔ
جفا میں اس کی ہے اندازِ کار فرما کا

حضرت منولال صبا نے یہی مضمون اپنے ایک شعر میں ادا کیا ہے اور حق یہ ہے کہ اس کا اسلوبِ بیان مرزا کے شعر کے مقابلے میں بدرجہا بہتر ہے ؎

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں — کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

اس سلسلے میں کسی اُستاد کا ایک شعر یاد آگیا جو ہم مضمون تو نہیں مگر اپنے رنگ میں خوب ہے۔ لیجئے آپ بھی سُنیے ؎

شریکِ جورِ فلک گر جفائے یار نہ ہو — تباہیِ دل و دیں ہم کو ناگوار نہ ہو

مرزا ؎ ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں
وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا

اس مضمون پر کئی شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے۔ ناظم کا شعر ہے ؎

اس ایک ترچھی نگہ سے نہ کیوں چھدیں دونوں — جگر سے بھی تو محرّف ہے فاصلہ دل کا

پنڈت راج نراین زمان دہلوی مرحوم تلمیذِ داغ نے یہ مضمون اپنے ایک شعر میں یوں ادا کیا ہے ؎

تیغِ نگاہِ یار کے دونوں شہید ہیں — اب دل کی لوں خبر کہ سنبھالوں جگر کو میں

پنڈت امرناتھ آشفتہ دہلوی مرحوم کا یہ شعر بھی اسی مضمون کا حامل ہے ؎

تیغِ نگاہ اس کی غضب کاٹ کر گئی — سینے سے دل میں دل سے جگر میں گزر گئی

مرزا اعظم کے اس شعر کا مفہوم بھی یہی ہے ؎

سن لیجیو کہ تیغِ نگہ کام کر گئی ‌ ‌ ‌ دل میں جگر میں سینہ میں سر میں جہاں لگی

اس سلسلے میں بیخود دہلوی مرحوم کا یہ پھڑکتا ہوا شعر بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ شعر کی روانی اور بے تکلفی قابلِ داد ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

دل سے نکل گیا کہ جگر سے نکل گیا ‌ ‌ ‌ تیرِ نگاہِ ناز کدھر سے نکل گیا

یہ مضمون کسی اور شاعر نے مرزا سے یوں چھیننے کی کوشش کی ہے ؎

اب ہیں اک تیر میں سُفتہ جگر و دل دونوں ‌ ‌ ‌ گئے وہ دن کہ تھا بیمار سے بیمار جدا

ظاہر ہے کہ اس شعر میں کوئی خوبی نہیں۔

مرزا ؎ تنگیٔ دل کا گلہ کیا یہ وہ کافر دل ہے ‌ ‌ ‌ کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

حضرت اکبر الہ آبادی کا یہ شعر دوسرے رُخ سے اسی خیال کی ترجمانی کر رہا ہے ؎

غنچہ مُرجھا کے گرا شاخ سے افسوس نہ کر ‌ ‌ ‌ کھل بھی جاتا تو یہی تھا کہ پریشاں ہوتا

مرزا ؎ نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

یہ مضمون بھی حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم نے کسی قدر مختلف اندازِ بیاں اختیار کر کے اس طرح ادا کیا ہے ؎ جدائی نے مجھے بنایا مجھ کو جدا نہ ہوتا تو میں نہ ہوتا
خدا کی ہستی ہے مجھ سے ثابت خدا نہ ہوتا تو میں نہ ہوتا

اکبر نے مصرعۂ ثانی میں ایک اور گوشہ نکال لیا ہے۔

مرزا ؎ شرحِ اسبابِ گرفتاریٔ خاطر مت پوچھ
اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

"مرزا یاس عظیم آبادی نے جو غالب کے طرزِ بیاں اور دقت پسندی کے سخت ترین مخالف ہیں اور جنھوں نے مرزا کی زبان کو دیوداد کی زبان کہا ہے اپنی صاف زبان میں یوں اس کی شرح کی ہے ؎ زندگی کشمکشِ رنج و محن میں گزری ‌ ‌ ‌ چار دیوارِ عناصر کو میں زنداں سمجھا
حالاں کہ مرزا غالب کے یہاں زنداں سمجھنے کے مناسب الفاظ موجود ہیں مثلاً گرفتاری،

تنگی وغیرہ مگر یہاں یہ کچھ نہیں ہے۔ صرف چار دیواری ہے جس سے زنداں کے ثابت کرنے کی بے جا کوشش کی گئی ہے مگر ہم اس بات کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ غالب کے الفاظ و خیال کو خوب بدل دیا ہے۔" (آسی) ہمارے نزدیک محض ہم قافیہ یا بظاہر مشابہ ہونے کی بنا پر یاس کے شعر کو غالب کے شعر کی شرح قرار دینا درست نہیں۔ ان دو شعروں کے مضمون میں بہت کچھ فرق ہے۔

مرزا ؎ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

یہ مضمون مولانا رضا علی وحشت نے یوں کہا ہے ؎

چین آئے گا کہاں دل کو خدا ہی جانے دشت بھی وہی وحشت ہے جو تھی گھر سے مجھے

مرزا کا شعر پہلو دار ہے۔ اس کے مقابلے میں وحشت کا شعر بالکل سپاٹ ہے۔

مرزا ؎ میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

میر حسین تسکین نے اس کی تقلید میں یوں کہا ہے ؎

کوچۂ یار میں میں نے تسکین پاؤں رکھا تھا کہ سر یاد آیا

ظاہر ہے کہ زمینِ شعر اور نشستِ الفاظ کی ترکیب میں مماثلت کے باوجود یہ دو شعر ہم مضمون نہیں۔ مرزا ؎

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

انور نے ذرا پہلو بدل کر یوں کہا ہے ؎

مرتا ہوں یوں کہ بستۂ فتراک کیوں نہیں میں ہوں وہی کہ تم جسے نخچیر کر چکے

مولانا آسی کا انداز بھی دیکھیے ؎

یاد کر یاد میں وہ ہوں جسے بھولا ہے تو اب تو پہچان لے اے وعدہ فراموش مجھے

مرزا ؎ تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا

یہ شعر پہلو دار ہے۔ اس خصوصیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے ساتھ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔ ناظم کا شعر ہے ؎

تو کسی کا ہو دوست! میں ناحق دشمنِ اہلِ روزگار ہوا

تنگی وغیرہ مگر یہاں یہ کچھ نہیں ہے۔ صرف چار دیوار ہے جس سے زنداں کے ثابت کرنے کی بے جا کوشش کی گئی ہے مگر ہم اس بات کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ غالب کے الفاظ و خیال کو خوب بدل دیا ہے۔" (آسی) ہمارے نزدیک محض ہم قافیہ یا بظاہر تشابہ ہونے کی بنا پر یاس کے شعر کو غالب کے شعر کی شرح قرار دینا درست نہیں۔ ان دو شعروں کے مضمون میں بہت کچھ فرق ہے۔

مرزا ؎ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے ۔۔۔ دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

یہ مضمون مولانا رضا علی وحشت نے یوں کہا ہے ؎

چین آئے گا کہاں دل کو خدا ہی جانے ۔۔۔ دشت بھی وہی وحشت ہے جو تھی گھر سے مجھے

مرزا کا شعر پہلو دار ہے۔ اس کے مقابلے میں وحشت کا شعر بالکل سپاٹ ہے۔

مرزا ؎ میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد ۔۔۔ سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

میر حسین تسکین نے اس کی تقلید میں یوں کہا ہے ؎

کوچۂ یار میں میں نے تسکین ۔۔۔ پاؤں رکھا تھا کہ سر یاد آیا

ظاہر ہے کہ زمینِ شعر اور نشستِ الفاظ کی ترکیب میں مماثلت کے باوجود یہ دو شعر ہم مضمون نہیں۔ مرزا ؎

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں ۔۔۔ کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

انور نے ذرا پہلو بدل کر یوں کہا ہے ؎

مرتا ہوں یوں کہ بندۂ فتراک کیوں نہیں ۔۔۔ میں ہوں وہی کہ تم جسے نخچیر کر چکے

مولانا آسی کا انداز بھی دیکھیے ؎

یاد کر یاد میں وہ ہوں جسے بھولا ہے تو ۔۔۔ اب تو پہچان لے اے وعدہ فراموش مجھے

مرزا ؎ تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا ۔۔۔ اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا

یہ شعر پہلو دار ہے۔ اس خصوصیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کے ساتھ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔ ناظم کا شعر ہے ؎

تو کسی کا ہو دوست! میں ناحق ۔۔۔ دشمنِ اہلِ روزگار ہوا

مرزا داغ کا یہ شعر دیکھئے ؎

اے فلک تو نے دیا تھا غم جو کھانے کے لئے
وہ بھی حصہ کر دیا سارے زمانے کے لئے

حضرت مومن خاں مومن کے مندرجۂ ذیل شعر میں بھی اس مضمون کے ایک پہلو کی جھلک نظر آرہی ہے ؎

ستم میں اپنے کسی کو مرا شریک نہ کر
مرے لئے ہی اک امتیاز رہنے دے

غالباً یہ کہنا بیجا نہیں کہ مندرجۂ صدر تمام اشعار مرزا کے اسلوب بیاں سے محروم ہیں۔

مرزا ؎
جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

حضرت اکبر الہ آبادی نے یہ مضمون بھی اپنے ایک شعر میں باندھا ہے لیکن دوسرے ڈھنگ سے ؎

تصدیق ہوئی دیکھ کے وہ قامتِ زیبا
سنتا تھا کہ فتنے ہیں قیامت کے سوا بھی

مرزا قدِ یار کا عالم دیکھ کر فتنۂ قیامت کے معتقد ہو گئے اور اکبر کے نزدیک دوست کا قامتِ زیبا دیکھ کر اس بات کی تصدیق ہوئی کہ فقط قیامت ہی فتنہ نہیں بلکہ قامتِ یار بھی ایک فتنہ ہے۔ اس سلسلے میں حضرتِ فانی بدایونی کا یہ شعر بھی ملاحظہ کیجئے ؎

اک کفر سراپا نے کیا حشر کا قائل
میں معتقدِ حشر مجسم نہ ہوا تھا

مرزا ؎
میں سادہ دل آزردگیِ یار سے خوش ہوں
یعنی سبقِ شوقِ مکرر نہ ہوا تھا

اس کے ساتھ مرزا داغ کا شعر دیکھئے ؎

جھکی ذرا چشمِ جنگجو بھی نکل گئی دل کی آرزو بھی
بڑا مزا اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

مرزا کو آزردگی کے بعد دوست سے صلح ہو جانے کا یقین ہے جس کی بنا پر انہیں تجدیدِ شوق میں دوبارہ لطف حاصل ہونے کی امید ہے اور مرزا داغ اس ملاپ میں جو لڑائی کے بعد ہو جائے بڑا مزا پاتے ہیں۔ مرزا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

کپتان الکزینڈر ہیدرلی آزاد اسی مضمون کو دوسرے الفاظ میں اس طرح باندھتے ہیں ؎

وہ گرم روِ راہِ معاصی ہوں جہاں میں
گرمی سے رہا نام نہ دامن میں تری کا

مرزا ؎ مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا
کس قدر یارب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

حضرتِ اکبرؔ الہ آبادی نے یہ مضمون بھی تھوڑے سے تغیر کے ساتھ اپنے ایک شعر میں داخل کیا ہے ؎

شوقِ پابوسیٔ جاناں مجھے باقی ہے ہنوز گھاس اُگتی ہے جو تربت پہ حنا ہوتی ہے

برسوں گزر گئے۔ راقم کی کم سنی کا زمانہ تھا کہ قوالی کی ایک محفل میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا جہاں ایک قوّال کی زبانی ایک شعر سُنا۔ قوال کی خوش الحانی اور اداکاری نے حاضرین کو بے حد محظوظ کیا۔ وہ شعر بھولتا نہیں۔ لیجئے آپ بھی سُنیئے ؎

پسِ مُردن بنائے جائیں گے ساغر مری گِل کے لبِ جاں بخش کے بوسے ملیں گے خاک میں مِل کے

بنیادی خیال اس شعر کا بھی وہی ہے جو مرزا اور اکبرؔ کے شعروں میں ہے لیکن بیان کا عالم جُدا ہے۔ مرزا ؎

قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریئے اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

اس کے ساتھ ظفرؔ کا شعر دیکھئے ؎

کوئی پوچھے خطائے نامہ بر کیا تھی ہوا یہ کیا کہ خط کی طرح کیوں پُرزے پُرزے اس نے قاصد کے

نواب میر محبوب علی نظام الملک آصف جاہ آصفؔ نے بھی بالکل یہی مضمون مرزا کا اپنے اس شعر میں شامل کیا ہے ؎

ایلچی کو بھی کوئی قتل کیا کرتا ہے میں خطا وار تھا قاصد تو خطا وار نہ تھا

مرزا ؎ جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا

حضرتِ آرزوؔ لکھنوی کے یہاں بھی یہ مضمون خفیف سے تغیرِ الفاظ کے ساتھ ملتا ہے ؎

افسردہ دل کی مجمعِ حسرت میں قدر کیا بجھ کر چراغ لائقِ محفل نہیں رہا

حضرتِ ثاقبؔ لکھنوی نے بھی مرزا کے شعر سے مِلتا جُلتا شعر کہا ہے مگر اس میں کچھ جدت پیدا کی ہے ؎

ٹھہری نہ کوئی شئے بھی جب ساتھ جانے والی
ہستی کی انجمن سے اک داغ لے چلا میں

ان اشعار کے ساتھ مولانا آسی کا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو ؎

لے چلا باغِ جہاں سے گلِ داغِ ہستی پئے یارانِ عدم مل گئی سوغات مجھے

مرزا ؎ واکر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن

غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

اپنے ایک سخن فہم دوست نے ہمیں مرزا کے اس شعر کی طرف توجہ دلائی اور کہا کہ ہمارے مندرجۂ ذیل شعر کا مضمون باوجود اس کے کہ اس کی نوعیت میں فرق ہے۔ مرزا سے مستعار لیا گیا ہے۔ حالاں کہ یہ صحیح معلوم نہیں ہوتا ؎

ہے اضطرابِ شوق نقابِ رُخِ امید تارِ نگاہ پردۂ مژگاں سے کم نہیں

مرزا قوی نے یوں باندھا ہے ؎

اب دور کیا ہیں جلوۂ جاناں کی لذتیں اک پردہ رہ گیا ہے سو وہ بھی نگاہ کا

مرزا ؎ رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف

عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

ناظم نے یہ مضمون اختصار سے یوں باندھا ہے ؎

رشکِ اقبالِ غیر بجا ہے تو کسی کا کب آشنا ہوگا

مرزا ؎ شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز

ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

مولانا حسرت موہانی کا مندرجۂ ذیل شعر مرزا کے اس شعر سے کتنا مشابہ ہے ؎

شوق سے تیرے بڑھے کیا کیا دلوں کے مرتبے ہر ذرّوں کو کیا قطروں کو دریا کر دیا

مرزا کہتے ہیں۔ شوق عاشقوں کا سرمایۂ ناز ہے جس کی بدولت ذرہ صحرا اور قطرہ دریا ہونے کا دعوے کرنے لگتا ہے۔ مولانا حسرت کے شعر کا ماحصل بھی یہی ہے۔

مرزا ؎ دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے

بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا

ناظم کے یہاں بھی یہ مضمون تنکرار پایا جاتا ہے لیکن مختلف اندازِ بیاں میں جو اتنا اچھا نہیں ؎

ن: اس در پہ آنے جانے کی صورت بنی رہے — درباں ہوا تو شحنۂ شہر آشنا ہوا

ن: خوش ہو رہے تھے ہم کہ بنایا ہے اس کو یار — دیکھا تو ان کے در پہ وہ درباں ہی نہیں

مرزا کے شعر کے مقابلے میں ناظم کے دونوں شعر ناقص ہیں۔

مرزا ـــہ ناکردہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو — دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا

چالیس پینتالیس سال کا عرصہ ہوا کہ لالہ سری رام صاحب ایم۔ اے دہلوی مرحوم مؤلف تذکرۂ "خمخانۂ جاوید" بغرضِ سیر و تفریح سری نگر تشریف لائے تھے۔ ان کے اعزاز میں ایک شاندار مشاعرہ ایس۔ پی۔ کالج سری نگر کے ہال میں منعقد کیا گیا۔ جس میں لالہ صاحب مرحوم کی خدمت میں شعرائے کشمیر کی طرف سے ان کی ادبی خدمات کے لیے راقم نے ایک سپاس نامہ بھی پیش کیا تھا۔ اس یادگار مشاعرہ میں راقم الحروف، پنڈت دینا ناتھ مست کاشمیری، ماہ جوی، چودھری خوشی محمد ناظر اور علامہ کیفی دہلوی کے علاوہ اور کئی مقامی و بیرونی شعراء نے شرکت کی تھی۔ میرِ مشاعرہ کے فرائض ناظر مرحوم نے انجام دیئے۔ منجملہ دیگر شعراء کے خاں صاحب منشی سراج الدین احمد نے ایک غیر طرحی غزل پڑھ کر سنائی۔ اس کا ایک شعر جس کی حاضرینِ جلسہ نے خوب داد دی تھی اور آج تک مجھے یاد ہے یہ تھا ؎

دکھائی ایسی ہمدردی کہ بے کھٹکے رقیبوں نے — سُنا دی داستاں اپنی سمجھ کر رازداں مجھ کو

شعر خوب ہے لیکن یہ بات اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں کہ یہ مرزا کے مندرجہ صدر شعر کا مضمون دوسرے الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔ تاہم اندازِ بیاں اچھا ہے۔ مرزا ؎

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں — ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

اس کے ساتھ تسلیم لکھنوی کا یہ شعر دیکھیے ؎

آسماں گردش میں ہیں میرے ستانے کیلئے — چکیاں تو چل رہی ہیں ایک دانے کیلئے

اب ذیل میں کسی اور کا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو ؎

ن: بے ہیں ظلم ہفت افلاک کے — امتحاں ہیں ایک مشتِ خاک کے

مرزا ـــہ ہو گئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ — یارب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

منشی محمد یعقوب برقؔ جالندھری نے مرزا سے یہ مضمون چھین لینے کی یوں کوشش کی ہے ؎

جی چاہتا ہے خط سے وہاں جاؤں پیشتر
اللہ رے شوقِ دیدِ دلِ بے قرار کا

پنڈت راج نرائن ارمانؔ دہلوی مرحوم کے یہاں یہ مضمون اس طرح جلوہ گر ہے ؎

خود ہی پہنچ گیا ہوں وہاں بہر التجا
طرزِ بیاں بتاتا ہوا نامہ بر کو میں

کسی اور شاعر کا یہ شعر بھی اسی مضمون کا ہے ؎

دے کے خط کون انتظار کرے
اپنے قاصد کے ہم رکاب ہوں میں

مومنؔ کا اندازِ بیان دیکھیے ؎

رشکِ پیغام ہے عناں کشِ دل
نامہ بر راہ بر نہ ہو جائے

مرزا ؎

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا

مرزا داغؔ نے اپنے خاص انداز میں یہ مضمون یوں باندھا ہے ؎

حضرتِ داغؔ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے
اور ہوں گے تری محفل سے اُبھرنے والے

معروفؔ نے بھی مضمون یوں کہا ہے ؎

سر رہے یا نہ رہے اس سے سروکار نہیں
ہم ترے در سے نہیں سر کو اٹھانے والے

اور محشرؔ لکھنوی نے اس طرح بیان کیا ہے ؎

آج اُٹھے جاتے ہیں درباں کی جفا سے لیکن
زندگی بھر کہیں چھٹتا ہے درِ خانۂ دوست

اب حضرتِ فراقؔ گورکھپوری کا شعر ملاحظہ فرمایئے۔ انہوں نے بادنیٰ تغیر اس مضمون سے ایک اور مضمون پیدا کیا ہے ؎

یہ نہیں ہوتی تھی حالت جانبِ در دیکھ کر
آستانِ یار سے ہم آج اٹھ جائیں گے کیا

مرزا ؎ عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

سید محمد حسین کوثرؔ لکھنوی نے مرزا کا یہ مضمون اپنے الفاظ میں باندھا ہے مگر اُن کے یہاں معنی محدود ہو گئے ہیں ؎

آخر غمِ فراق ہی راحت فزا ہوا
جب درد بڑھ گیا تو وہی اک دوا ہوا

مرزا ؎ تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جُدا ہو جانا

کسی شاعر نے یہ مضمون یوں اُڑا لیا ہے ؎

قفلِ ابجد کی طرح تھی مری قسمت شاید بنتے ہی بات کے ہوتا ہے وہ عیّار جُدا

مرزا ؎ ضعف سے گریہ مبدّل بہ دمِ سرد ہوا باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

مرزا ثاقب نے دوسری تمثیل پیش کر کے یہ مضمون یوں کہا ہے ؎

خاک بھی اس دلِ سوزاں کی ملے گی نہ کہیں مجھے معلوم ہے شعلے کا ہوا ہو جانا

ظاہر ہے کہ مرزا ثاقب مضمون کو کچھ ترقی نہیں دے سکے ہیں۔

جس طرح اردو کے اکثر شعراء نے مرزا کے اردو کلام سے استفادہ کیا ہے اسی طرح بعض نامور شعراء نے ان کے فارسی کلام سے بھی مضامین اخذ کرنے اور کسی نہ کسی صورت میں بہرہ یاب ہونے سے گریز نہیں کیا ہے۔ ردیف الف میں مرزا کی ایک غزل کا شعر ہے ؎

آشنایانہ کشد خارِ رہت دامنِ ما گوئی ایں بود ازیں پیش بہ پیراہنِ ما

حضرتِ جگر مرادآبادی نے اس مضمون کو اردو کا جامہ یوں پہنایا ہے ؎

نظر سے ان کی پہلی ہی نظر یوں مل گئی اپنی کہ جیسے مدتوں سے تھی کسی سے دوستی اپنی

غزلیاتِ فارسی ہی کی ردیف ت میں مرزا کا ایک برجستہ شعر ہے ؎

بے خود بوقتِ ذبح تپیدن گناہِ من دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہِ کیست

امیر مینائی نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے ؎

تڑپا میں وقتِ ذبح تو مجھ سے خطا ہوئی خنجر کیا نہ تیز یہ کس کا قصور تھا

مرزا لو ہم مریضِ عشق کے تیماردار ہیں
اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

دیکھیے اس طائرِ خیال نے مختلف استادوں کے یہاں کیا کیا پر و بال نکالے ہیں

نسّاخ نے یہ مضمون یوں ادا کیا ہے ؎

تم سے ہوا نہ دردِ دلِ زار کا علاج پھر کون سے مرض کی بتاؤ دوا ہو تم

اور امیر کہتا ہے ؎

پوچھتا میں جو مسیحا کہیں مجھ کو ملتے دردِ دل کی بھی تمہیں کوئی دوا آتی ہے

صبا کا اندازِ بیان دیکھیے۔

مجھ سے بیمارِ محبت کا جو ہوگا نہ علاج کیا کہیں گے تجھے اے جانِ مسیحا دل میں

مرزا داغ کے دو شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

۱؎ دم مری آنکھوں میں اٹکا ہے کہ دیکھوں تو سہی
کیا مسیحا سے مرے درد کا درماں ہوگا

۲؎ علاجِ دردِ دل تم سے مسیحا ہو نہیں سکتا تم اچھا کر نہیں سکتے میں اچھا ہو نہیں سکتا

سحر نے کہا ہے ؎

وہ نام ہی کے مسیحا ہیں کیا جلائیں گے کوئی مریضِ محبت بحال بھی نہ ہوا

برق نے یوں باندھا ہے ؎

عاقبت ان سے علاجِ دلِ ناداں نہ ہوا نہ ہوا عیسیٔ دوراں سے بھی درماں نہ ہوا

مرزا آسماں جاہ انجم کی زبانی بھی سنیئے ؎

جو مسیح تم ہے بھی تو کیا ہوگا ہو گیا درد لا دوا اب تو

کسی اور شاعر کا شعر ہے ؎

کچھ دل کے درد کا نہ اگر ہو سکا علاج پھر چارہ ساز تو ہی بتا تیرا کیا علاج

ان اشعار کے ساتھ عاشق کے یہ دو شعر بھی دیکھیے ؎

۱؎ ناحق مسیح کو مرضِ عشق کے لئے ہو کے شرمسار کیا ہم نے کیا کیا

۲؎ مردے زندہ ہوں مگر بیمارِ عشق اچھے نہ ہوں
ڈالنا ہاتھ ان مریضوں پر مسیحا دیکھ کر

حضرت ظہیر دہلوی نے اس مضمون سے ایک اور مضمون نکالا ہے اور نئے اسلوب سے باندھا ہے ؎

گر نہ ہو درمانِ درد اے چارہ گر اتنا تو ہو　　درد سر مٹ جائے تیرا دردِ سر اتنا تو ہو

یعنی دردِ سر اتنا بڑھ جائے کہ تو مرض کو لا علاج سمجھ کر چلا جائے کیونکہ تو بھی میرے لئے ایک دردِ سر ہے۔ مرزا ؎

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی　　کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

حضرت منور خاں غافل نے بھی ایسے ہی مضمون کا شعر کہا ہے مگر یہ مرزا کے شعر سے پست ہے ؎

گرم بازاریٔ الفت ہے مجھی سے ورنہ　　کوئی لینے کا نہیں نام وفا میرے بعد

مرزا　　آئے ہے بیکسیٔ عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

مرزا داغؔ نے یہ مضمون مختصر الفاظ میں دوسرے انداز سے کہا ہے اور خوب کہا ہے ؎

آج راہی جہاں سے داغؔ ہوا　　خانۂ عشق بے چراغ ہوا

اسی مضمون پر حضرت نوحؔ ناروی کا شعر بھی دیکھیے ؎

ترے عشق کا خاتمہ ہو گیا　　مرے کون اب میرے مرنے کے بعد

مرزا کے کلیاتِ فارسی کی ردیف د میں ایک غزل کا شعر ہے

مے بہ زاہد مکن عرض کہ ایں جوہرِ ناب　　پیشِ ایں قوم بہ شورابۂ زمزم نرسد

حضرت فراقؔ گورکھپوری نے اردو میں ترجمہ کر کے اسے یوں اپنایا ہے ؎

زحمتِ مے زاہد کو مت دے　　ان کو پلا شورابۂ زمزم

مرزا ؎　　ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے
کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر در و دیوار

اس کے ساتھ کسی استاد کا یہ شعر بھی پڑھیے ؎

گھر سے باہر جو نکلتا ہوں میں صحرا کی طرف　　پاؤں پڑ پڑ کے مناتا ہے گریباں مجھ کو

اس کا مضمون مرزا کے مضمون سے ملتا ہے مگر جو جدائی کیفیت مرزا کے شعر میں ہے اس میں نہیں۔

مرزا ؎ واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ

ہم کو حریصِ لذّتِ آزار دیکھ کر

حضرت اصغر گونڈوی نے اس مضمون کو دوسرے رنگ میں ادا کر کے کچھ ندرت پیدا کی ہے ؎

نگۂ ناز کو یہ بھی تو گوارا نہ ہوا اک ذرا درد میں ملتی تھی جو راحت مجھ کو

مرزا ؎ گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

یہ مضمون حضرتِ جگر مرادآبادی نے بھی کہا ہے ؎

جس کا جتنا ظرف ہے اس سے سوا ملتا نہیں جلوۂ ساقی بقدرِ ہمّتِ مردانہ ہے

مرزا ؎ مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ یاد آیا

کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

یہ مضمون حضرتِ فانی کے یہاں بھی پایا جاتا ہے اور اثر سے خالی نہیں ؎

بدلا ہوا تھا رنگ گلوں کا ترے بغیر کچھ خاک سی اڑی ہوئی سارے چمن میں تھی

مرزا ؎ جنوں کی دستگیری کس سے ہو گر ہو نہ عریانی

گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر

کسی شاعر کا یہ شعر بھی اسی مضمون کا حامل ہے ؎

جنوں کا میرے سانجھی زندگی بھر تھا تو اک یہ تھا

مری گردن پہ احساں رہ گیا میرے گریباں کا

مرزا ؎ اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے

کہ مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

پروفیسر فراق گورکھپوری نے مرزا کے اس شعر کے مفہوم کو اپنے ایک شعر میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے ؎

تجھے مغالطہ نہ ہونے دیں گے کاروبارِ الفت میں ہم اپنے سر ترا اے دوست ہر نقصان لیتے ہیں

ان دو شعروں کے مصراعِ اوّل میں نوعیتِ مضمون کے لحاظ سے کچھ فرق نو ضرور ہے لیکن

اس سے قطع نظر مرزا کا شعر جیسا وجد آور ہے فراقؔ کا اس کے مقابلے میں بے کیف ہے۔

مرزا ؎ منہ گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے
خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس

معشوق اس وقت عاشق کی ملاقات یا عیادت کو آتا ہے جبکہ وہ قریبِ مرگ یا عالمِ نزع میں ہوتا ہے اور اسے معشوق کی اس بے وقت عنایت کا کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ ملاحظہ فرمایئے کہ اس مضمون نے شاعروں کے ہاتھ پڑ کر کیا کیا رنگ بدلے۔ استاد ذوقؔ کہتے ہیں ؎

کیا آئے تم جو آئے گھڑی دو گھڑی کے بعد
سینے میں ہوگی سانس اڑی دو گھڑی کے بعد

بادشاہ ظفرؔ کا شعر ہے ؎

کہاں طاقت کہ دیکھیں آنکھ بھر کر دم ہے آنکھوں میں
اُسے گر ہم نے وقتِ واپسیں دیکھا تو کیا دیکھا

سرورؔ نے کہا ہے ؎

اب عیادت کو آئے سود نہیں
دم آخر ہے دم درود نہیں

منشی محمد خان طالبؔ کہتے ہیں ؎

بہرِ عیادت آئیں تو اس وقت آئیں گے
جس وقت مجھ سے تب بھی بلایا نہ جائے گا

مرزا داغؔ کا مخصوص اندازِ بیان دیکھیے ؎

آپ کے منتظر تھے ہم دمِ نزع
تھا بڑا وقت آئے اچھے وقت

منشی سید امیر حیدر بختؔ اس خیال کو اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

وائے قسمت کب عیادت کے لیے آیا ہے وہ
جبکہ بیمارِ محبت میں رہا کچھ بھی نہیں

حضرت مہذبؔ لکھنوی کا شعر بھی ملاحظہ کیجیے ؎

اشارے سے بیمارِ غم نے کہا
اب آئے کہ جب سانس اکھڑنے لگی

اب آخر میں مولانا حسرتؔ موہانی کا بھی ایک شعر ملاحظہ فرمایئے۔ مولانا نے اس مضمون سے ایک اور شگفتہ مضمون نکالا ہے ؎

دمِ واپسیں آئے پرسش کو ناحق
بس اب جاؤ تم سے خفا ہو گئے ہم

مرزا ؎
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

حضرتِ رند نے یہ مضمون یوں باندھا ہے ؎

مر بھی گئے ہم واہ ری غفلت ان کو خبر بھی نہ اصلا گزری

مرزا ؎
یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

علامہ اقبال مرحوم نے بالکل یہی مضمون ذیل کے شعر میں قلمبند کیا ہے ؎

آیا ہے تو جہاں میں مثالِ شرار دیکھ دم دے نہ جائے ہستیٔ ناپایدار دیکھ

مرزا ؎
آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

اس کے ساتھ پنڈت ہری چند اختر مرحوم کا یہ شعر بھی دیکھئے ؎

تو مرے اعمال کا پابند نکلا حشر میں اے خدا میرے خدا تجھ کو خدا سمجھا تھا میں

مرزا ؎
خوش حال اس حریفِ سیہ مست کا کہ جو
رکھتا ہو مثلِ سایۂ گل سر بپائے گل

یہ شعر پڑھ کر مرزا داغ کا مندرجۂ ذیل شعر باوجود اس کے کہ مرزا کے شعر سے ادائے مطالب میں کچھ مختلف ہے ہم رنگ ہونے کی وجہ سے یاد آجاتا ہے ؎

غش کھا کے داغ یار کے قدموں پہ گر پڑا بے ہوش نے بھی کیا ہوشیار کا

مرزا ؎
آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

اس کے ساتھ حضرت سائل دہلوی مرحوم کا یہ ہم آہنگ شعر بھی ملاحظہ ہو ؎

حرف جو منہ سے نکلتے ہیں وہ کٹ جاتے ہیں دردِ دل سامنے ان کے نہ ہوا مجھ سے بیاں

اور منشی احمد علی شوق قدوائی کا یہ شعر بھی اس سلسلے میں سامنے رکھیئے ؎

رعبِ حسن گلا دبائے تھا منہ سے نکلتی کیا آواز قصد تو اس سے کچھ کہنے کا میں نے لاکھوں بار کیا

شوقؔ نے منہ سے آواز نہ نکلنے کی وجہ پریشانی خاطر نہیں بلکہ حسن کا رعب بتایا ہے۔

مرزا ؎

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

حضرت سخاؔ شاہجہاں پوری نے اس مضمون سے ایک اور گوشہ نکال لیا ہے ؎

سرحد ادراک سے ملحق ہے اس کا آستاں
ختم یہ منزل جہاں ہو سر وہیں خم کیجئے

سخاؔ کا یہ شعر بھی واقعی قابلِ داد ہے۔

مرزا ؎

نے سبحہ سے علاقہ نہ ساغر سے واسطہ
میں معرضِ مثال میں دستِ بریدہ ہوں

اس کے ساتھ کسی اور شاعر کا یہ شعر دیکھیے ؎

میں وہ دانہ ہوں جو گر جائے کفِ میزان سے
نہ خریدار کا حصہ ہوں نہ حق بائع کا

مرزا کہتے ہیں۔ میری مثال ایک کٹے ہوتے ہاتھ کی ہے جو نہ تسبیح پھیر سکتا ہے اور نہ جام کو اٹھا سکتا ہے یعنی میں زاہد ہو سکتا ہوں نہ رند۔ میری ہستی بے کار و بے مصرف ہے۔ دوسرا شاعر کہتا ہے۔ میں ترازو کے پلڑے سے گرے ہوتے اس دانے کے مانند ہوں جو نہ تو خریدار کو ملتا ہے اور نہ بیچنے والے کا حق ہوتا ہے۔ مضمون یکساں ہے البتہ بیان کا عالم مختلف ہے۔ مرزا ؎

ذرّے اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں
ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب

اس قسم کا مضمون مرزا ذاغؔ کے مندرجہ ذیل شعر میں بھی پایا جاتا ہے ؎

میں نہ مانوں گا کہ عارض پر تمہارے خال ہے
جم گئی ہے آنکھ کی پتلی کسی مشتاق کی

مرزا کے نزدیک محبوب کے روزنِ دیوار میں جو ذرّے نظر آتے ہیں ذرّے نہیں ہیں بلکہ آفتاب کی مشتاق نگاہوں کے اجزا ہیں۔ مرزا داغؔ رخسارِ محبوب پر تل کو تل نہیں سمجھتے بلکہ چشمِ عاشق کی پتلی جو وہاں جم کر رہ گئی ہے۔ یہاں بھی دونوں استادوں کا مضمون یکساں ہے۔ صرف بیان کا عالم مختلف ہے۔ مرزا ؎

غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں
زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن

علامہ اقبال نے بھی یہ مضمون اپنے ایک شعر میں ادا کیا ہے۔ صرف الفاظ بدلے ہوتے ہیں ؎

علاجِ دردمیں بھی درد کی لذت پہ مرتا ہوں | جو تھے پاؤں میں کانٹے نوکِ سوزن سے نکالے ہیں

منشی محمد الطاف حسین خاں الطاف کا یہ شعر بھی اسی مضمون کا ہے ؎

وہ خلش دوست ہوں رکھ لیتا ہوں پھر چھالوں میں

جب مرے تلوؤں سے ہوتا ہے کوئی خار جدا

مرزا ؎ ہوں فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود

قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

مرزا داغ جب آخری ایام عمر میں کبرسنی اور ضعفِ پیری کی وجہ سے روزے نہ رکھ سکے تھے تو انہوں نے ایک رباعی کہی جس کے پہلے دو مصرعوں کا مضمون یہی ہے ؎

وہ ضعف ہے دم سے نکلا نہیں جاتا | دنیا سے بھی اب تو نہیں اٹھا جاتا[1]

اس مضمون پر مرزا داغ کا یہ شعر بھی دیکھیے ؎

ضعف اس درجہ بڑھا ہے کہ الٰہی توبہ | درد بھی اب تو بدلتا نہیں پہلو اپنا

آغا اشرف علی اوج لکھنوی کی زبانی بھی یہ مضمون سنیے ؎

جاں بلب ہوں دیر سے دم توڑنا ممکن نہیں | کس قدر غالب ہے مجھ پر ناتوانی وقتِ نزع

امراؤ مرزا انور نے یہ مضمون یوں کہا ہے ؎

ضعف میں مرنا بھی مشکل ہو گیا | جان الجھی ہے نفس کے تار سے

مرزا ؎ نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے

بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

مولانا آسی نے بھی یہ مضمون اپنے ایک شعر میں داخل کیا ہے۔ صرف تمثیل بدل دی ہے ؎

کشتیِ غم کی روانی بھی ہے اے دل غنیمت | یہ بھی اک دن نہ رہے گی گرداب فنا ہو جائے گی

---

[1] پوری رباعی یہ ہے ؎

وہ ضعف ہے دم سے نکلا نہیں جاتا | دنیا سے بھی اب تو نہیں اٹھا جاتا

گھر میں تو بہت طاق ہیں لیکن اے داغ | روزہ کہیں ہم سے نہیں رکھا جاتا

مرزا ۔ ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں
اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں

حضرت ناطق لکھنوی کا ہم مضمون شعر دیکھیے ۔

مذاق ہے یہ جفا کچھ جفا نہیں ہمدم   یونہی وہ دیکھ رہے ہیں ذرا ستا کے مجھے

مرزا ۔ بوسہ نہیں نہ دیجیے دشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

عاشق نے مرزا کا یہ مضمون تقریباً لفظ بہ لفظ اڑا لیا ہے ۔

عاشق کو بوسہ دیتے نہیں گالیاں تو دو   نام خدا زبان تو ہے گو دہاں نہیں

اس مضمون کا ایک شعر حضرت ناطق نے بھی کہا ہے مگر یہ مرزا کے شعر کے مقابلے میں پست ہے ۔

نہ دے بوسہ تو اچھا گالیاں دے کر دعا لے لے   غرض لے دے کے رخصت کر دے جو تجھ کو تیرے

مرزا ۔ نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

یہ مضمون مفتی صدر الدین خاں آزردہ نے بھی خوب باندھا ہے ۔

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں   اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

مرزا ۔ جب کرم رخصتِ بیباکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

اس مضمون کی نکھری ہوئی صورت منشی امیر مینائی امیر کے مندرجہ ذیل دو شعروں میں دیکھیے ۔

۱۔ موقوف جرم ہی پہ کرم کا ظہور تھا   بندے اگر قصور نہ کرتے قصور تھا

۲۔ بندہ نوازیوں پہ خدائے کریم تھا   کرتا نہ میں گنہ تو گناہِ عظیم تھا

مولانا راسخ کے شعرِ ذیل سے بھی یہی رنگ ٹپکتا ہے ۔

گنہگار نہ ہوتے تو عفو کیا ہوتا   الٰہی تیرے کرم کا ظہور ہم سے ہوا

حضرت امداد مرزا انور دہلوی کی زبانی بھی یہ مضمون سنیے ۔

دامن وسیع دیکھ کے عفوِ کریم کا   ارماں ہے بیگناہ کے دل میں گناہ کا

مرزا، امیر، راسخ اور انور کے مندرجہ بالا اشعار بنیادی طور پر ہم مضمون ہیں البتہ اندازِ بیان میں فرق ہے۔ مرزا کے شعر میں مجازی رنگ غالب ہے۔

مرزا ~ ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

اس کے ساتھ بادشاہ ظفر کا شعر بھی دیکھئے ~

ہے قیامت سے اس کو کیا نسبت
تیرے قامت کا اور ہے نقشہ

قاضی نجم الدین برق دہلوی کا یہ شعر بھی ملاحظہ کیجئے ~

ترا قامت بنا کر صانعِ قدرت نے فرمایا
کہ یہ فتنہ رہے گا دو قدم آگے قیامت سے

برق غالباً مرزا سے مضمون اخذ کرنے میں بے نیاز نہیں۔ بااین ہمہ اس کا اندازِ بیان اچھا ہے
حضرت جگر مرادآبادی نے بھی یہ مضمون کہا ہے لیکن شعر میں کوئی خاص بات نہیں ~

سلسلہ فتنۂ قیامت کا
تری خوش قامتی سے ملتا ہے

مرزا ~ کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

کسی اور شاعر کا شعر ہے ~

کیا کیا درازیٔ شبِ غم جاں نواز ہے
عاشق کی عمرِ خضر سے بھی کچھ دراز ہے

مرزا ~ قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں وہ جو لکھیں گے جواب میں

مرزا داغ نے اس سے ایک اور پہلو نکالا ہے ~

کیا کیا فریب دل کو دیئے اضطراب میں
ان کی طرف سے آپ لکھے خط جواب میں

حضرت سلام مچھلی شہری نے کروٹ بدل کر کہا ہے ~

میں نے کچھ ان کو لکھا تو ہے مگر یاد نہیں
دیکھئے کیا مرے اس خط کا جواب آتا ہے

مرزا ~ مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

رسالہ شاعر آگرہ بابت ماہ جنوری ۱۹۴۳ء بابت ہی لالہ گوردیال لال ناجی کی

ایک طرحی غزل نظر سے گزری۔ اس کا ایک شعر مرزا کے مندرجہ صدر شعر سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے اگرچہ نامی صاحب نے مضمون کو الگ کر دکھانے کی کوشش کی ہے۔ ان دو شعروں میں حضرت شراب میں کچھ ملائے جانے کی توجیہ مختلف ہے ؎

کچھ بے طرح سے آج تو لطفِ خمار ہے ساقی نے جانے کیا ہے ملایا شراب میں

مرزا داغ نے بھی اپنے خاص شوخ انداز میں اس مضمون کا ایک شعر کہا ہے ؎

غیر دیتا ہے کیوں مجھے ساغر سانپ ہو زیرِ آستیں نہ کہیں

مرزا ؎ غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی

پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

چاندنی رات میں لطفِ مے نوشی کے مضمون پر حضرت جگر مرادآبادی کا یہ شعر بھی دیکھئے

؎ یہ فصلِ گل، سماں یہ شبِ ماہتاب کا لا ساقیا شراب مزا ہے شراب کا

حق تو یہ ہے کہ جگر کے اندازِ بیان میں جو کیف آفرینی ہے مرزا کے شعر میں نہیں۔

مرزا ؎ کل کے لیے کر آج نہ خسّت شراب میں

یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

اس کے ساتھ صبا کا یہ شعر پڑھنا لطف سے خالی نہیں ؎

مے طہور مجھے واعظو خدا دے گا وہ جانتا ہے کہ رندِ شراب خوار ہوں میں

مرزا ؎ جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع

گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

اس شعر کے ساتھ مولانا طباطبائی کا یہ شعر بھی ملاحظہ کیجیے ؎

صدائے چنگ سے مجھ کو یہی آواز آتی ہے کوئی کہتا ہے اب پردے سے ہم باہر نکلتے ہیں

عجب نہیں کہ مرزا کے شعر نے مولانا کو یہ مضمون سمجھا دیا ہو مگر مولانا نے اپنے شعر میں جدت کا جو پہلو نکالا ہے وجد انگیز ہے اور شعر تازہ تخلیق سے کم نہیں۔

مرزا ؎ رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

مولوی محمد حسین آزاد کا شعر ہے ؎

جہازِ عمرِ رواں پر سوار بیٹھے ہیں — سوار خاک ہیں بے اختیار بیٹھے ہیں

دونوں شعروں کا مضمون واحد ہے مگر مرزا کے شعر میں جو محاکات پائی جاتی ہے آزاد کا شعر اس سے محروم ہے۔ مرزا ؎

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے — حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

مہاراجہ سرکشن پرشاد شادؔ نے یہ مضمون اپنے ایک شعر میں یوں باندھا ہے لیکن اُن کا شعر غالبؔ کے مقابلے میں پست ہے ؎

آئینہ بھی ہے تو ہی شخص تو ہی عکس تو ہی — اصل میں ایک ہیں سب تیری قسم غیر نہیں

مرزا ؎ شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

مولانا حسرتؔ موہانی نے بھی یہ مضمون خوب باندھا ہے۔ لیجیے سُنیے ؎

چھپے جو مجھ سے تو کیا یہ بھی اک ادا نہ ہوئی — وہ چاہتے تھے نہ دیکھے کوئی ادا میری

مرزا ؎ ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

"غالبؔ کے اس شعر کے بعد دوسرے کے لیے پہلو بچا کر یوں کہنا جیسا کہ فانیؔ نے کہا مشکل تھا ؎ ہر جلوہ غیب شہود ہے پھر بھی غیب کے جلوے غیب [illegible]
نظارہ نظر میں شامل ہے نظارے [illegible] [illegible] ہیں

مگر انصاف یہ ہے کہ غالبؔ کا شعر ندرت کے اعتبار [illegible] جواب ہے۔ جب ایسا ہے تو دعوئے وجود کی جو حقیقت ہے معلوم ہے"[1]

مرزا ؎ ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں — غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

منشی اصغر علی خاں اصغرؔ کا شعر ذیل مرزا کے مندرجۂ صدر شعر سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے لیکن جو بات مرزا کے شعر میں ہے اصغرؔ پیدا نہیں کر سکے ؎

---

[1] ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی۔ رسالہ "نوائے ادب" بمبئی۔ (جولائی سنہ ۱۹۶۸ء)

نفرت ہے یہ محبوب کو وہ کہتے ہیں عدو سے ذکر اس کا بادی سے بھی نہ آئے مرے آگے

اس مضمون پر مرزا داغ کا بھی ایک شعر سُنیے۔ اس میں بھی مرزا کے شعر کے مقابلے میں کوئی خوبی نہیں ؎

داغ کے نام سے نفرت ہے وہ جل جاتے ہیں
ذکر کم بخت کا آنے کو تو اکثر آیا

ان اشعار کے ساتھ ظہیر کا یہ شعر بھی سُنیے ؎

وہ مرا نام بھی لینے کے روادار نہیں غیر کیا جا کے کریں ان سے شکایت میری

مرزا ؎
شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

میاں عبداللہ شاہ خاموش نے یہ مضمون اپنے الفاظ میں اس طرح ادا کیا ہے ؎

دو عالم کی ہستی ہے موہوم ساری جسے دیکھتا ہوں عدم جانتا ہوں

مرزا کا شعر شاعرانہ اندازِ بیان لیے ہوئے ہے خاموش کا مضمون اس سے عاری ہے۔

مرزا ؎
ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائیٔ غالب
میرے دعویٰ پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

ناظم نے اسی مضمون کے مطابق اور اسی رنگ میں اپنے ایک خیال کا اظہار کیا ہے ؎

افسانۂ مجنوں سے نہیں کم مرا قصہ • اس بات کو جانے دو کہ مشہور نہیں ہے

مرزا ؎
وائے محرومیٔ تسلیم و بدا حالِ وفا
جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں

مرزا داغ کا ہم آہنگ شعر دیکھیے ؎

ہوئے مغرور وہ جب آہ میری بے اثر دیکھی کسی کا اس طرح یارب نہ دنیا میں بھرم نکلے

مرزا ؎
کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم
ہو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کریں

یہی مفہوم کسی اور شاعر کے اس شعر کا بھی ہے ؎

درد ہو تو دوا کرے کوئی مرنے والے کا کیا کرے کوئی

مرزا ؎ نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

اس کے ساتھ عاشق کا شعر ملاحظہ ہو ؎

زخم کیوں دیکھتے ہو ڈر ہے مبادا ہو جائے دست و بازو کو ترے قاتلِ خونخوار نظر

مرزا ؎ نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

اس کے ساتھ مولانا آسیؔ کا یہ شعر سامنے رکھیے ؎

بُرا ہو شامِ غم کا اس نے کافر کر دیا مجھ کو میں قائل ہی نہیں اب روزِ محشر کی درازی کا

مرزا قیامت کے قائل ہیں لیکن اس کو شبِ فراق سے زیادہ بڑھ صاحب نہیں سمجھتے۔ مولانا آسیؔ کو شامِ غم نے کافر بنا دیا اس لیے کہ اس کے مقابلے میں وہ روزِ محشر کی درازی کا قائل نہیں۔ مضمون کی نوعیت یکساں ہے۔ مرزا شبِ فراق کے شدائد کے مقابلے میں شدائدِ محشر کو کچھ نہیں سمجھتے اور مولانا کے نزدیک شامِ غم کے مقابلے میں روزِ محشر کی درازی کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔

مرزا ؎ جہاں میں ہوں غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

کسی شاعر نے اس کی نقل ذیل کے شعر میں اتار دی ہے لیکن مضمون کا اسلوبِ بیان مرزا کے اسلوب سے پست ہے ؎

ہمیں عشرت سے کیا مطلب ہمیں راحت سے کیا مطلب
ہوا ہے حسرت و غم سے خمیر آب و گل اپنا

مرزا ؎ سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

مولانا آسیؔ نے یہ مضمون ایک رباعی میں قلمبند کیا ہے۔ رباعی اچھی ہے مگر مجموعی حیثیت مرزا کا شعر بہتر ہے ؎

کیا سرخ رُخ ہے کتنا خوش نما ہے لالہ　　　تجھ کو معلوم ہے کہ کیا ہے لالہ
لالہ سے بھی بڑھ کے تھا وہ گل آسی　　　جس لالہ کی خاک سے اُگا ہے لالہ

مرزا ؎
جو یہ خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

منشی تلوک چند محروم نے یہ مضمون یوں باندھا ہے ؎

روشن ہوئی ان سے شامِ فرقت　　　محروم یہ اشک ہیں کہ تارے

محروم نے اختصار سے مضمون ادا کیا ہے اور شعر بھی بجائے خود خوب ہے مگر اس درد و اثر سے محروم ہے جو مرزا کے شعر کا طرۂ امتیاز ہے۔

مرزا ؎
میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

یہ مضمون کسی اور شاعر نے اس طرح ادا کیا ہے ؎

کچھ قمریوں کو یاد ہیں کچھ بلبلوں کو حفظ　　　دنیا میں ٹکڑے ٹکڑے مری داستاں کے ہیں

اور علامہ اقبال نے اپنے الفاظ میں یہی مضمون یوں باندھا ہے ؎

اڑالی قمریوں نے، طوطیوں نے، عندلیبوں نے　　　چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

مرزا ؎
وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیٔ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

اس کے ساتھ مولانا حسرت موہانی کا یہ برجستہ شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

دل کو توڑا ابروؤں نے اور گلے کاٹے نہیں　　　نیمچے کوتاہیٔ قسمت سے نشتر ہو گئے

مرزا تعجب کرتے ہیں کہ محبوب کی نگاہیں جو ان کی کوتاہیٔ قسمت سے مژگاں بن کر رہ گئیں باوجود اتنا ہی کے کیوں کر دل کے پار ہوئی جاتی ہیں۔ حسرت نے ابروؤں کو نیمچے قرار دیا ہے جو دل کو توڑ سکے مگر گلے کاٹنے میں ناکام رہے گویا قسمت کی کوتاہی سے یہ نیمچے نشتر ہو گئے۔ دونوں شعر بجائے خود خوب ہیں اور باہمی مناسبت رکھتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے جداگانہ صورت و معنی کے حامل ہیں۔

مرزا ؎ رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پہ کہ آساں ہوگئیں

یہ مضمون حضرت اکبر الہ آبادی اور حضرت امیر بدایونی دونوں نے باندھا ہے۔ اکبر کا شعر ہے ؎

امتیازِ حسرت و رنج و الم جاتا رہا غم ہوا اتنا کہ اب احساسِ غم جاتا رہا

اور امیر نے کہا ہے ؎

امتیازِ الم جور و ستم بھی نہ رہا کثرتِ غم سے اب اندازۂ غم بھی نہ رہا

ان تینوں شعروں کے معیار میں مضمون یا طرزِ ادا کے اعتبار سے کوئی خاص فرق نہیں۔

مرزا ؎ یونہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

منشی لچھمی پرشاد آزرؔ نے اس مضمون کو اپنے الفاظ میں مختصر طور پر ادا کرنے کی کوشش کی ہے ؎ کہیں بیٹھ جائے نہ بنیادِ گردوں
کہ اشکوں سے طوفاں اٹھا چاہتا ہے

آزرؔ کا شعر بالکل سپاٹ ہے۔

مرزا ؎ جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

مرزا ارشد دہلوی کا یہ شعر دیکھیے مرزا کے شعر سے کتنا قریب ہے ؎

حسن ان کا تاب سوز نگہ اپنی ناتواں وہ بے حجابیوں پہ بھی یاں سو حجاب میں

حضرت فراقؔ گورکھپوری نے بھی یہ مضمون یوں کہا ہے ؎

حجاب میں بھی اسے دیکھنا قیامت ہے نقاب میں بھی رُخِ شعلہ زن کی آنچ نہ پوچھ

مرزا کا مطلب یہ ہے کہ محبوب کا حسن دوپہر کے آفتاب کی طرح قوتِ نظارہ کو جلا کر رکھ دیتا ہے۔ اس پر آنکھ نہیں ٹھہر سکتی۔ یہ حالت ایک پردہ ہے۔ اس کے ہوتے اس کو منہ چھپانے کی ضرورت نہیں۔ ارشد کہتا ہے کہ عاشق کی کمزور نگاہ حسنِ محبوب کی تاب نہیں لا سکتی۔ اس لیے بے حجابی کی حالت میں بھی وہ حجاب میں ہے۔ فراقؔ کے نزدیک،

محبوب کے رُخِ شہابِ رنگ کی تابانی اور بھڑک ایسی ہے کہ اُسے پردے میں دیکھنا قیامت ہے تینوں استادوں کا مقصودِ کلام ایک ہے یعنی حسنِ محبوب کی آب و تاب کے سامنے آنکھ ٹھہر نہیں سکتی۔ صرف اندازِ بیان میں کچھ فرق ہے۔

مرزا ؎ واں وہ غرورِ عزّ و ناز یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

یہ مضمون حضرت نوحؔ ناروی مرحوم کے یہاں بھی بندھا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مرزا نے صراحت سے بیان کیا ہے اور نوحؔ نے کنایوں سے ؎

اسے سو طرح کا لحاظ ہے ہمیں سو طرح کا خیال ہے
کہیں آئیں کیوں کہیں جائیں کیوں کہیں آئیں کیا کہیں جائیں کیا

مرزا ؎ طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

یہ مضمون علامہ اقبالؔ کے یہاں بھی ملتا ہے ؎

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

مرزا ؎ ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ
ہرچند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو

مولانا آسیؔ نے اس مضمون کو ایک اور پہلو سے پیش کیا ہے اور حق یہ ہے کہ لطف سے خالی نہیں ؎
کرتے ہیں شبِ وصل وہ دشمن کی برائی میں کہتا ہوں آخر وہ تمہیں آ ہی گیا یاد

مرزا ؎ ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

یہ مضمون اثرؔ نے یوں باندھا ہے ؎

ہم دل سے ہم سخن رہے دل ہم سے ہم سخن خلوت میں بھی مکالمۂ انجمن رہا

ایک نوجوان شاعر علی جلال جعفری کا ایک شعر حال میں نظر سے گزرا۔ اس میں بھی یہ مضمون دوسرے رُخ سے ادا کیا گیا ہے ؎

ذہن کے پردے پہ رقصاں ہے ترا حسنِ جمال   کون کہتا ہے تجھے ہم سامنے پاتے نہیں

مرزا ؎   اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسدؔ
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

اس کے ساتھ حضرت وزیرؔ کا یہ شعر بھی دیکھیے ؎

نہیں اٹھنے کے قاتل کی گلی سے
کہ ہم بیٹھے ہیں سر سے ہاتھ اٹھا کر

اور پھر حضرت اسیرؔ کا یہ شعر بھی ملاحظہ کیجیے ؎

کوچے میں تیرے پاؤں کو جب گاڑ کے بیٹھا   اٹھنے کا نہیں بندۂ درگاہ مہینوں

مرزا ؎   نہیں گر ہمدمی آساں نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے
نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو

مرزا داغؔ نے بھی رشک کا ایسا ہی مضمون لکھا ہے لیکن دوسرے رنگ میں ؎

شرکتِ غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری   غیر کی ہو کے رہے یا شبِ فرقت میری

مرزا کہتے ہیں۔ اگرچہ رقیب کے لیے دوست کی ہمدمی آسان نہیں لیکن میرے لیے یہ رشک کیا کم ہے کہ وہ بھی آرزوئے دوست رکھتا ہے۔ اس کو یہ آرزو بھی نصیب نہیں ہونی چاہیے تھی۔ مرزا داغؔ رشک سے رقیب کا غم میں شریک ہونا گوارا نہیں کرتے یہاں تک کہ شبِ فراق میں بھی وہ شرکتِ غیر نہیں چاہتے۔ دونوں کے یہاں ابتلائے رشک کا مضمون بیان ہوا ہے۔ صرف اندازِ بیان میں کچھ فرق ہے۔

مرزا ؎   وفا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

ابتدائے سخن گوئی کے زمانے میں راقم کا کہا ہوا ایک شعر ہے ؎

خواہشِ سجدہ ہے سنگِ آستانِ یار پر   پھوڑنا سر کا ہے گویا نقشِ پیشانی مجھے

استادِ نامدار علامہ کیفی دہلوی مرحوم کی نظر سے یہ شعر گزرا تو فرمایا کہ یہ مرزا کے مندرجہ بالا شعر سے پرتو پذیر دکھائی دیتا ہے۔ ممکن ہے شعر کہتے وقت مرزا کے شعر کا پس منظر ہمارے

ذہن کے پردے پر عکس افگن رہا ہو۔

مرزا ؎ غلط ہے جذب دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

یہ مضمون مرزا کے شاگرد حضرت سخن دہلوی نے بھی اسی زمین میں تھوڑے سے تغیر کے ساتھ ادا کیا ہے مگر دونوں کے اسلوب بیان سے استادی و شاگردی کا فرق ظاہر ہے ؎

کرے گر وہ مرے جذب دلِ بیتاب کا شکوہ سخن پھر مجھ کو اس بُت سے شکایت درمیاں کیوں ہو

مرزا ؎ یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے اس کا دشمن آسماں کیوں ہو

اس کے ساتھ سخن صاحب کا ایک اور شعر دیکھیے۔ اس میں انہوں نے مضمون کا رُخ کچھ بدل دیا ہے ؎

ستم جو ہو رہے ہیں مجھ پر ہیں فقط تیرے تغافل سے اگر تو دوست ہو میرا تو دشمن آسماں کیوں ہو

مرزا معشوق کی دوستی کو فتنہ قرار دے کر کہتے ہیں کہ اس کا دوست بننا آدمی کی خانہ ویرانی کے لیے کیا کم ہے جو آسمان کو اس کے ساتھ دشمنی کرنے کی ضرورت پڑے۔ سخن دوست کے تغافل کو تمام ظلم و ستم کا باعث سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر وہ مہربان ہو تو آسمان کی کیا مجال کہ وہ دشمنی کرے۔

مرزا ؎ یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

یہ مضمون بھی مرزا داغ نے اپنے رنگ میں خوب کہا ہے ؎

ہو چکا قطع تعلق تو جفائیں کیوں ہوں جنہیں مطلب نہیں رہتا وہ ستاتے بھی نہیں

"قنوطیت" کے عنوان کے تحت منجملہ دیگر اشعار کے ہم مرزا کی تین اشعار پر مشتمل ایک غزل درج کر چکے ہیں جس کا مطلع ہے ؎

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

راقم نے شعر گوئی کے ابتدائی زمانہ (۱۹۱۶ء تا ۱۹۱۷ء) میں مرزا کی اس غزل

سے متاثر ہو کر اسی زمین میں آٹھ نو اشعار کی ایک غزل کہی تھی جو انہی دنوں میں رسالہ "شیو شنبھو" لاہور، اخبار "اتحاد" امرت سر اور ماہنامہ "طریقت" لاہور وغیرہ میں شائع ہوئی تھی۔
اس کے تین چار شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

"رہئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو" — مہرباں کوئی نہ ہو نامہرباں کوئی نہ ہو
ٹوٹ جائے میری پستی سے بلندی کا غرور — اس زمیں پر سایہ افگن آسماں کوئی نہ ہو
جلوۂ حسنِ ازل تصویرِ حیرت کر بجھے — لب پہ حسن و عشق کی پھر داستاں کوئی نہ ہو
تا نہ جائے اے خدا شیرازۂ عالم بکھر — ہو نہ کوئی ہم نفس اور رازداں کوئی نہ ہو

تقریباً تیرہ سال کے بعد پنجاب کے مشہور شاعر اختر شیرانی مرحوم کی کہی ایک غزل اسی زمین میں ماہنامہ "چمنستان" امرت سر (بابت ماہ اپریل ۱۹۳۰ء) میں شائع ہوئی۔
اس کے بھی چار شعر پیش خدمت ہیں ؎

اہلِ عالم ہوں نہ ربطِ دوستی و دشمنی — "مہرباں کوئی نہ ہو نامہرباں کوئی نہ ہو"
کلفت افزا ہوں نہ حسن و عشق کے راز و نیاز — کوئی دلدادہ نہ ہو اور دلستاں کوئی نہ ہو
اپنی فریادوں کی لَے میں رات دن کھوئے رہیں — ہم تو کوئی نہ ہو ہم داستاں کوئی نہ ہو
دل میں پیدا ہی نہ ہو اوّل تو دردِ آرزو — ہو تو اس کی بے کسی کا رازداں کوئی نہ ہو

راقم نے پہلا مصرع مرزا سے لیا ہے اور اختر مرحوم نے مندرجہ صدر اشعار کے پہلے شعر کا مصرعِ ثانی راقم سے۔ اگر راقم کی یہ غزل حضرتِ اختر کی نظر سے گزری ہوگی تو گمان غالب ہے کہ انہوں نے راقم کا مصرع دانستہ جزوِ شعر بنالیا ہے۔ اگر ایسی بات نہیں تو یہ اتفاق توارد واقعی حیرت انگیز ہے۔

مرزا ؎

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر — آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

حضرت ثابت کشمیری کا مندرجہ ذیل شعر بھی اسی مضمون کا ہے ؎

رو رہا ہوں بسکہ تم کو دل آزار دیکھ کر — ہنستا ہوں آج تم کو گرفتار دیکھ کر

مرزا ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

حضرت اکبر الٰہ آبادی کا یہ ہم مضمون شعر دیکھیے ؎

کوئی گناہ ہو مدِّ نظر معاذ اللہ ۔۔۔ شراب پیتا ہوں میں بس سروری کے لیے

مرزا ؎ ۔۔۔ کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

بابو جانکی پرشاد ورما شاؔد مرحوم نے دوسرے انداز سے یہ مضمون یوں کہا ہے ؎

غیر کے ملنے سے اور انکار رہنے دیجیے ۔۔۔ مجھ کو یاد آگیا سرکار رہنے دیجیے

اس سلسلے میں امراؤ مرزا انور دہلوی مرحوم کا ایک نادر اور پھڑکتا ہوا شعر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے جو مرزا کے اس شعر کا ہم مضمون تو نہیں لیکن بنائے خیال کے اعتبار سے ہم آہنگ اور مفہوم میں مماثلت ہونے کے لحاظ سے اس سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے ؎

نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے ۔۔۔ پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے

مرزا کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق نے رقیب کو بوسہ دیا ہے لیکن وہ اس بات سے منکر ہے کہتے ہیں کہ ان کے پاس اس بات کا ثبوت ہے کہ رقیب کو بوسہ دیا گیا ہے۔ اگر بولنے پر آتے تو معشوق کو قائل کر دیں گے لیکن وہ خفگی سے زیادہ گفتگو کرنا پسند نہیں کرتے۔ شاؔد طنزیہ انداز میں مطلب ادا کر کے معشوق کی اس بات کو کہ اس نے رقیب کے ملنے سے انکار کر دیا قابلِ اعتبار قرار نہیں دیتا۔ مرزا انوؔر کا شعر ایک دفترِ معنی ہے وہ کہتے ہیں کہ معشوق رقیب سے مل کے آیا ہے۔ وہ اس بات کو عاشق سے پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا لیکن چوں کہ اس کے دل میں چور تھا عاشق سے دوچار ہونے پر شرم سے پسینے پسینے ہو گیا۔ عاشق سمجھ گیا کہ وہ رقیب سے ملاقات کر کے آگیا ہے۔ اس کی پیشانی کا پسینہ اس خیال کی تصدیق کر رہا ہے۔ مرزا انوؔر کا اندازِ بیان بے بدل ہے[1]

مرزا ؎ ۔۔۔ کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشگال
ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے

---

[1] اس شعر کی مفصل شرح اور خاطر خواہ وضاحت کے لئے ملاحظہ ہو "ہماری شاعری" مصنفہ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب۔ (طبع ششم) صفحہ ۲۰۶ - ۲۰۷۔

اس مضمون پر مرزا داغ کا ہم مضمون شعر ملاحظہ ہو ؎

شبِ تاریک ہیں گھنگھور گھٹا چھائی ہے کاش گنتے جو نمودار ستارے ہو

مرزا داغ نے اس مضمون کو ایک اور پہلو سے بھی پیش کیا ہے ؎

تارے گن گن کے گزاری شبِ دیجورِ فراق کیا مصیبت تھی جو گنتی کے ستارے ہو

مرزا ؎ ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

بنیظیرؔ کا ہم مضمون شعر زیادہ سلجھا ہوا ہے ؎

فریبِ ہستی عالم حجاب ہے ورنہ نہ رازہی کوئی ہوتا نہ رازداں ہو

مرزا ؎ خزاں کیا، فصلِ گل کہتے ہیں کس کو، کوئی موسم ہو

وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

شارقؔ کانپوری اسی مضمون کو اس طرح بیان کرتا ہے ؎

خوش ہوں کیا اہلِ قفس فصلِ بہار آنے سے دل بدلتا نہیں منظر کے بدل جانے سے

شارقؔ کا شعر اپنے رنگ میں خوب ہے مگر مرزا کے اسلوبِ بیان اور حسنِ بندش کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

مرزا ؎ قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

مولانا حسرتؔ موہانی نے یہ مضمون دوسرے انداز سے کہا ہے ؎

ایسے بگڑے کہ پھر جفا بھی نہ کی دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا

دونوں کے مفہوم میں خیال کی بِنا ایک ہے۔ صرف اسلوبِ بیاں مختلف ہے۔

مرزا ؎ ڈھونڈھے ہے اس مغنّی آتش نفس کو جی

جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

حضرت جگرؔ مرادآبادی کا یہ شعر اس کے ساتھ پڑھنا لطف سے خالی نہ ہوگا ؎

شاید اسی کا نام مقامِ فنا نہ ہو نازک سا ہو نا جاتا ہے دل ہر صدا کے بعد

اور پھر مولانا حالیؔ کا یہ شعر سامنے رکھنا بھی شاید بے محل نہ ہو ؎

ڈھونڈھتا ہے دلِ شوریدہ بہانے مطرب   درد انگیز غزل کوئی نہ گاتا ہرگز

مرزا ۔   صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو

دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

مرزا کے اس سوقیانہ شعر کا مضمون مومن نے جس دلپذیر پیرایہ میں باندھا ہے قابلِ تعریف ہے ۔

بے پردہ غیر سے نہ ہوا ہوگا شب کہ صبح   آنکھوں میں شرم تھی نہ نظر میں حجاب تھا

مرزا ۔   دور چشمِ بد تری بزمِ طرب سے واہ واہ

نغمہ ہو جاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے

کسی اور شاعر کا مندرجۂ ذیل شعر دوسرے رنگ میں اسی خیال کی ترجمانی کر رہا ہے ۔

اُف اثر کا میری آنکھوں سے ہوا ہو جانا   جاتے جاتے ترے کوچے میں صبا ہو جانا

مرزا ۔   گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

یہ مضمون منشی امیر مینائی امیر نے بھی لکھا ہے اور حق تو یہ ہے بہت خوب لکھا ہے ۔

وہ دشمنی سے دیکھتے ہیں دیکھتے تو ہیں   میں شاد ہوں کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں

مرزا ۔   ہے دلِ شوریدۂ غالب طلسمِ پیچ و تاب

رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

یہ مضمون کسی اور شاعر نے بھی باندھا ہے لیکن اس کا شعر مرزا کے شعر کے مقابلے میں پھیکا پھیکا سا ہے ۔

اس میں تری محبت اس میں تری تمنا   میرے دلِ حزیں پر کچھ سوچ کر جفا کر

مرزا ۔   ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی

اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

اسی رنگ میں مومن کا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو ۔

بوالہوس اور لافِ جانبازی   کھیل ہی کیا سمجھ لیا ہے عشق

ثابت کشمیری نے یہ مضمون یوں کہا ہے ؎

جس کو دیکھو وہ لافِ عشق میں مست　　کوچۂ عشق راہِ عام ہوا

اس سلسلے میں مرزا داغ کا یہ شعر بھی دیکھیے ؎

دل اپنا بیچتے پھرتے ہیں لاکھوں　　محبت آج کل پیسے دھڑی ہے

مرزا کی کئی غزلوں پر بہت سے شعراء نے تضمین کر کے اپنی جودتِ طبع کے جوہر دکھائے ہیں۔ مرزا عزیز بیگ مرزا سہارنپوری شاگردِ حضرت سوزاں شاگردِ مرزا غالب نے پورے دیوانِ غالب پر تضمین کی ہے جس کا نام انہوں نے "روحِ کلامِ غالب" رکھا ہے[1] غالباً فارسی یا اردو کا کوئی اور شاعر ایسا نہیں جس کے سارے دیوان کی غزلوں پر تضمین کی گئی ہو[2] یہ امر جہاں بجائے خود مرزا غالب کی عظیم اور بے بدل شخصیت کا ایک جیتا جاگتا ثبوت ہے وہیں مرزا سہارنپوری کا ایک ایسا مہتم بالشان کارنامہ ہے جس کی بے اختیار داد دینا پڑتی ہے اور جس پر وہ جتنا بھی ناز کریں بجا ہے۔ بخوفِ طوالت ہم "روحِ کلامِ غالب" اور دوسری متفرق تضمینوں سے قطع نظر کرتے ہیں۔ یہاں صرف مولوی امیر احمد صاحب امیر ٹونکی کی ایک تضمین قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں اور یہ اس لیے کہ یہ طرزِ جدید میں غیر معمولی نوعیت کی ہے اور بخلاف عام تضمینوں کے اس میں امیر نے مرزا کے ہر مصرعے سے استفادہ کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

مرزا ؎ کوئی دن گر زندگانی اور ہے　　اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

امیر ؎
چارہ فرما کوئی دن گر زندگانی اور ہے
جوشِ غم سے اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

---

[1] "روحِ کلامِ غالب" مصنفہ مرزا عزیز بیگ مرزا مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۳۵ء

[2] کچھ عرصہ ہوا کسی کی زبانی سنا تھا کہ مرزا عزیز بیگ کی طرح دیوانِ حافظ پر بھی کسی فارسی شاعر نے تضمین کی تھی معلوم نہیں اس بیان میں کہاں تک صداقت ہے۔ ہماری نظر سے کوئی ایسی کتاب نہیں گزری۔

مرزا ؎ آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں　　سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

امیرؔ ؎ شعلہ ہائے آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
التہابِ سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

مرزا ؎ بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں　　پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

امیرؔ ؎ یوں تو ہم نے بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں
جانِ مضطر پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

مرزا ؎ دے کے خط مُنہ دیکھتا ہے نامہ بر　　کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

امیرؔ ؎ کیا سبب ہے دے کے خط مُنہ دیکھتا ہے نامہ بر
صاف کہہ دے کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

مرزا ؎ قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم　　وہ بلائے آسمانی اور ہے

امیرؔ ؎ یہ بجا ہے قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم
جس کا ڈر ہے وہ بلائے آسمانی اور ہے

مرزا ؎ ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام　　ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

امیرؔ ؎ ہم نے مانا ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
پر ابھی تو ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

مرزا کی اس غزل کا یہ شعر ؎

دے کے خط مُنہ دیکھتا ہے نامہ بر　　کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

دیکھ کر شیخ ذوقؔ کے مندرجہ ذیل شعر کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے اگرچہ مضمون دوسرا ہے ؎

خط دے کے دل میں تھا کہ زبانی بھی کچھ کہے　　پر اس نے رکھ دیا دہنِ نامہ بر پہ ہاتھ

مرزا کے مقطع کا مضمون حضرتِ جوشؔ ملسیانی نے بھی خفیف سے فرق کے ساتھ اپنے ایک شعر میں داخل کیا ہے ؎

سب تمنائیں ہماری مر چکیں　　ایک مرنے کی تمنا رہ گئی

جوشؔ کے شعر میں مضمون کو کسی قدر بدل دیا گیا ہے اور اس طرح الگ کر دکھایا گیا ہے۔

مرزا ؎ ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

اس کے ساتھ حضرت اکبر الٰہ آبادی کا یہ شعر بھی ملاحظہ کیجئے۔ باوجود خفیف تغیرِ مفہوم کے شعرِ بالا سے ہم آہنگ ہے ؎

میرے سکوت سے مجھے ناداں نہ جانئے الفاظ کی کمی ہے خیالات کی نہیں

مرزا ؎ ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی

عدم نے مرزا کا پہلا مصرع بدل کر یوں کہا ہے ؎

کچھ تمہارا پتہ نہیں چلتا کچھ ہماری خبر نہیں آتی

اس تبدیلی نے مضمون کی صورت بدل دی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عدم نے نہایت موزوں مصرع چسپاں کیا ہے۔ حضرت اصغر گونڈوی نے بھی یہ مضمون لکھا ہے مگر اپنے مخصوص انداز میں ؎

اب نہ وہ قیل وقال ہے اب نہ وہ ذوق وحال ہے

میرا مقام ہے وہاں میرا جہاں گزر نہیں

مرزا ؎ ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

مرزا یاس (یگانہ چنگیزی) نے باوجود اس امر کے کہ وہ مرزا کو سخن دزد قرار دیتے ہیں اور ان کی شاعری کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے ان کے اس شعر کا مصرعۂ اوّل بدل کر دوسرے مصرعے کے سہارے ایک اور ہی مضمون پیدا کیا ہے ؎

دردِ دل کی کوئی دوا نہ دعا یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

دیوان جان بہاری لال راضی نے مرزا کا یہی مضمون اپنے الفاظ میں یوں ادا کیا ہے ؎

دل کو دل سے راہ ہوتی ہے اگر سچ ہے یہ بات تو مرا محبوب مجھ سے کس لئے بیزار ہے

ظاہر ہے کہ مرزا کا شعر بحیثیتِ مجموعی بہتر ہے۔

مرزا ؎ ہم کو ان سے وفا کی ہے امید جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

مولانا حسرت موہانی نے اس شعر کا مفہوم اپنے الفاظ کے قالب میں اس طرح ڈھالا ہے ؎

مل چکی ہم کو اُن سے دادِ وفا جو نہیں جانتے لگی دل کی

مرزا ؎ پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

ملاحظہ فرمایئے کہ کسی اور شاعر نے دوسرا اندازِ بیان اختیار کر کے کس طرح یہی مضمون لکھا ہے ؎

صیاد نے کس وقت لگایا ہے نشانہ
جب اُڑنے کو ہم شاخ پہ پر تول رہے تھے

یہ شعر طرزِ ادا اور اثر آفرینی میں مرزا کے شعر سے کچھ کم نہیں۔

مرزا ؎ لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اس شعر کی شرح کرتے ہوئے مولانا نظم طباطبائی اپنی تصنیف "شرح دیوان غالب" میں فرماتے ہیں۔

"کسی امر کی سزا میں ہاتھ قلم ہونا، یہ مضمون دوسرے مصرعے کا ہے اور پہلے مصرعے میں شاعر کے ذمے یہ بات ہے کہ اسے بیان کرے جس سبب سے ہاتھ قلم ہوئے۔ لیکن ایسی باتیں بہت سی ہو سکتی ہیں جس کے سبب سے ہاتھ قلم ہوں۔ اس مقام پر غزل کہنے والے کو یہ مشکل پیش آتی ہے کہ اتنے پہلوؤں میں سے کس پہلو کو اختیار کرے۔۔۔۔ ہاتھ سے صدہا فعل سرزد ہوتے ہیں۔ ان میں مرزا نے لکھنے کو اختیار کیا اس لیے کہ قلم کا ضلع نہ جانے پائے وغیرہ۔" [1]

اس کے بعد مولانا نے مرزا کے دوسرے مصرعے پر اپنی طرف سے سولہ سترہ مصرعے چسپاں کئے ہیں۔ چار پانچ آپ بھی ملاحظہ فرمایئے۔

چھوڑا نہ در کو یار کے کیا کیا ستم ہوئے
قاضی کے گھر سے شیشۂ صہبا نکال لائے
لکھی شکایت آنکھ چرانے کی یار کے
جنوں کی طرح چاک گریباں کیا کئے
چھونا سے بوسۂ خطِ رخسار لے لیا

} ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

---

[1] "شرح دیوان غالب" از مولوی سید علی حیدر طباطبائی مرحوم المتخلص بہ نظم و حیدر۔ [illegible] سرفراز پریس۔ لکھنو۔ صفحہ ۱۹۶۔

راقم کی ابتدائی مشقِ سخن کا زمانہ تھا جب مولانا مرحوم کی یہ شرح نظر سے گزری تھی[۱]۔ مرزا کے مصرعۂ ثانی پر مولانا کے بطورِ گرہ لگائے ہوئے مصرعے دیکھ کر اپنی طرف سے بھی کئی مصرعے لگانے کا شوق پیدا ہوا۔ ان میں سے بھی چار پانچ سُن لیجئے ؎

برہم زنِ حجاب دمِ شوق ہم ہوئے
دامن نہ چھوڑا جوشِ جنوں میں بھی یار کا
خط میں کیا خطاب و تغافل شعار دوست
باہیں گلے میں یار کے ہم ڈالتے رہے
مدحِ صنم لکھا کیے جب تک تھی دسترس
} ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اس ضمن میں مولانا ایک اور واقعہ بیان کرتے ہیں۔ اگرچہ مرزا کے کلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں لیکن اس خیال سے ممکن ہے قارئین اس سے لطف اندوز ہوں ہم اس کا ذکر یہاں کرتے ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں :۔

لکھنؤ میں ایک دفعہ یہ مصرع۔ اس لئے تصویرِ جاناں ہم نے کھچوائی نہیں۔ شعراء کے مطرح نظر تھا۔ ایک صاحب نے یہ مصرع لگایا ؎

ایک سے جب دو ہوئے پھر لطفِ یکتائی نہیں — اس لئے تصویرِ جاناں ہم نے کھچوائی نہیں

کسی نے یہ مصرع لگایا ؎

میں ہوں مشتاقِ سخن اور اس میں گویائی نہیں — اس لیے تصویرِ جاناں ہم نے کھچوائی نہیں

اس کے بعد مولانا مرحوم نے بیس اکیس مصرعے درج کیے ہیں جو انہوں نے اس طرح پر اپنی طرف سے لگائے تھے۔ ہم نمونے کے طور پر ان میں سے پانچ چھ مصرعے نقل کرتے ہیں۔ لیجئے سُنیئے ؎

اس میں وہ انداز وہ شوخی وہ رعنائی نہیں
روتے روتے رات دن آنکھوں میں بینائی نہیں
پیکرِ شیریں بنا کر کیا ملا فرہاد کو
} اس لیے تصویرِ جاناں ہم نے کھنچوائی نہیں

---

[۱] یہ واقعہ ۱۹۲۷ء کا ہے۔ (طالب)

دیکھنا اس کو تو ہو جاتا زمانہ بُت پرست
دیکھنے سے اس کے ہر دم ہوتی بیتابی سوا
جان ہے وہ جان کی صورت بنانی ہے محال } اس لیے تصویرِ جاناں ہم نے کھنچوائی نہیں

اس طرحی مصرعے پر بھی راقم نے کئی مصرعے لگائے تھے۔ ان میں سے بھی پانچ چھ ملاحظہ فرمایئے۔

صورتِ بیجاں ہمیں اس کی پسند آئی نہیں
دل کے آئینے میں آتا ہے نظر آٹھوں پہر
کھینچنے دیتی نہ اس کو حسن کی اپنے کشش
لطفِ صحبت میں ہمارے غیر ہو جاتے شریک
کھینچنے پاتا مصوّر بھی تو کب دیتا ہمیں
کاغذی فوٹو ہے رکھنا ظاہری عاشق کا کام } اس لیے تصویرِ جاناں ہم نے کھنچوائی نہیں

مرزا کا ایک مطلع ہے ؎

ظلمت کدہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

اس کے ساتھ حضرتِ فانی کا یہ ہم رنگ شعر پڑھنا خالی از دلچسپی نہیں ؎

ذرّہ ذرّہ تربتِ فانی کا شیون جوش ہے
اس صفِ ماتم میں اک شمعِ لحد خاموش ہے

مرزا کی اسی غزل میں مشہور قطعہ ہے ؎

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ نوائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبحدم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

پروفیسر کلیم الدین احمد صاحب نے اپنی تصنیف "سخنہائے گفتنی" میں حضرتِ جوش ملیح آبادی

کی ایک نظم "جوانی کی رات" پر تنقید کی ہے۔ اس نظم کا پہلا شعر یہ ہے ؎

شب کہ حریمِ ناز میں شورِ صدا ضطراب تھا عشق بھی تھا برہنہ سر حسن بھی بے نقاب تھا

اس تنقید کے دوران پروفیسر صاحب نے جوش کی نظم کا نظیر کی ایک ہم مضمون نظم سے مقابلہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ نظیر کی فضا خاص ہندی ہے۔ وہ جوش کی طرح ایرانی فضا پیدا نہیں کرتا۔ گو غالب کے قطعہ کی فضا بھی جوش کی نظم کی طرح ایرانی ہے لیکن اس میں بھی اصلیت دہی جوش ہے جو نظیر کی نظم میں ہے۔ پھر لکھتے ہیں کہ جوش کی نظم ان کا اپنا کارنامہ نہیں ہے۔ اس نظم میں شروع سے آخر تک غالب کا فیض ہے ؎

پروفیسر صاحب کی اس تنقید کی تردید میں حضرت نامی انصاری نے جن کے نزدیک یہ تنقید لایعنی اور بے سروپا ہے ماہنامہ "شاعر" بمبئی بابت ماہ فروری ۱۹۶۵ء میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہاں پروفیسر صاحب کی تنقید یا نامی صاحب کی تردید پر بحث کرنے کا موقع نہیں البتہ اتنا بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اردو شاعری پس منظر کو مدنظر رکھتے ہوئے نامی صاحب کے بیان میں بہت کچھ صداقت ہے اور پروفیسر صاحب یہ فرمانا کہ "جوش کی نظم باوجود ناکامیاب رہنے کے ان کا اپنا کارنامہ نہیں بلکہ اس میں شروع سے آخر تک مرزا غالب کا فیض ہے" مبالغہ سے خالی نہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ شاید ہی کوئی اور نقاد پروفیسر صاحب کی اس شدید نکتہ چینی کو حق بجانب قرار دے۔ ممکن ہے مرزا کی معنی خیز غزل نے جوش کی رہنمائی کی ہو اور انہوں نے بقدرِ ضرورت اس سے استفادہ بھی کیا ہو حالاں کہ یہ بھی ضرور نہیں مگر اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ چند معمولی خامیوں کے باوجود اس میں شاعرانہ جوہر اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ مرزا کے قطعہ "جوانی کی رات" کو بغور مطالعہ کرنے سے حقیقتِ حال ظاہر ہو جائے گی۔

مرزا ؎

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا

ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

ؔ "سخنہائے گفتنی" از پروفیسر کلیم الدین احمد۔ مطبوعہ سرفراز قومی پریس۔ لکھنؤ ۱۹۵۵ء ص ۹۴ - ۱۱۵۔

منشی امیر مینائی امیرؔ نے یہی مضمون اپنے دلپذیر اندازِ بیان اور ٹکسالی زبان میں یوں کہا ہے

؎ ساغرِ جم ہی پہ موقوف نہیں بادہ کشی ٹوٹا پھوٹا کوئی مٹی کا پیالا ہوتا

مرزا ؎ بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

میر انیسؔ نے یہ مضمون یوں کہا ہے ؎

طلب سے عار ہے اللہ کے فقیروں کو کہیں جو ہو گیا پھیرا صدا سنا کے چلے

اور مودبؔ لکھنوی نے اس طرح بیان کیا ہے ؎

اغنیا سے کیوں جھکیں ہم ہیں فقیر اللہ کے ہاتھ پھیلانے کسی کے در پہ جاتے ہی نہیں

مرزا ؎ ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

کسی اور شاعر نے دوسرے الفاظ کے لباس میں انداز بیان بدل کر یہ خیال یوں ظاہر کیا ہے ؎ مرے دل کے دھڑکنے کا انہیں کیونکر یقین آئے
ٹھہر جاتا ہے دل جب ہاتھ وہ سینے پہ دھرتے ہیں

اس کے ساتھ مولانا آسیؔ کا یہ شعر بھی دیکھیے ؎

دیکھتے ہی تجھے کیوں آ گئی منہ پر رونق کیا مرا رنگِ پریدہ تری تصویر میں تھا

کسی اور استاد نے بھی یہ مضمون اس طرح ادا کیا ہے ؎

یوں تو ہر روز رہا کرتی ہے حالت ابتر اُن کے آجانے سے بیمار سنبھل جاتا ہے

منشی ولایت احمد شمیمؔ کا یہ شعر بھی اسی مضمون کی ترجمانی کرتا ہے ؎

کچھ جو تسکین دیکھنے سے ان کے دل کو ہو گئی وہ یہ سمجھے دردِ دل سب مٹ گیا جاتا رہا

مرزا کا شعر اور اس کے بعد درج کیے گئے چار شعر ہم مضمون ہیں لیکن ان چاروں میں سے کوئی بھی اسلوب بیان اور طرزِ ادا میں مرزا کے شعر کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

مرزا ؎ قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

اس کے ساتھ علامہ اقبال کا یہ شعر بھی دیکھئے ؎

فردِ قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں   موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

مرزا ؎

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق

نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

مولانا رفیق مارہروی مؤلف "بزمِ داغ" نے اپنے مرحوم والد بزرگوار مولانا احسن مارہروی کے حوالے سے ان کی زبانی یوں نقل کیا ہے، "مرزا صاحب (یعنی مرزا داغ) نے فرمایا کہ میں ہر دوسرے تیسرے روز حضرتِ غالب کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ مختلف باتیں ہوا کرتی تھیں۔ شطرنج بھی ہوتی تھی۔ میں جب ہار جاتا تھا تو مرزا صاحب فرماتے کہ اس جرمانے میں اپنی غزل سنا دو۔ ایک دفعہ میں شطرنج کی بازی ہارا۔ حسبِ معمول مرزا صاحب بولے کہ غزل سنا دو۔ میں غزل پڑھنا ہی چاہتا تھا کہ فرمایا کہ میری کہی ہوئی زمین" ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے"، میں جو غزل تم نے کہی ہے وہ سناؤ۔ میں نے تعمیلِ حکم کی۔ میرے اس شعر پر ؎

اے فلک سامانِ محشر ہی سہی   اپنی آنکھوں کو تماشا چاہیے

مرزا غالب بولے۔ میرے خیال کی کتنی پیاری ترجمانی کی ہے۔ اور پھر اپنا (مندرجہ بالا) شعر پڑھا۔"[1]   مرزا ؎

شکوہ کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے   یہ بھی مت کہہ کہ جو کہیئے تو گلا ہوتا ہے

مرزا کے شاگرد حضرت سخن دہلوی نے یہ مضمون بھی اپنے الفاظ میں یوں کہا ہے ؎

یوں کسی پہ کوئی سرگرم جفا ہوتا ہے   پھر کچھ اے یار جو کہیئے تو گلا ہوتا ہے

مرزا ؎

پُر ہوں میں شکوہ سے یوں راگ سے جیسے باجا

اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

اس شعر کے تیور بتا رہے ہیں کہ علامہ اقبال مرحوم کی قابلِ قدر نظم "نوائے غم" کا پہلا شعر اسی شعر کا مولود ہے بلکہ عجب نہیں کہ ساری نظم کا محرک یہی شعر ہو۔

---

[1] "بزمِ داغ"، مؤلفہ مولانا رفیق مارہروی۔ ص۔ ۳۹۔

ملاحظہ فرمایئے ؎

زندگانی ہے مری مثلِ ربابِ خاموش جس کے ہر رنگ کے نغموں سے ہے لبریز آغوش

مرزا کا مشہور شعر ہے ؎

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

نثار علی خاں نثار اس مضمون کو محض اختصار سے ادا کرکے یوں اڑا لیتے ہیں ؎

مجھ سے کہتے ہیں وہ کہ تو کیا ہے کوئی پوچھے یہ گفتگو کیا ہے

یہاں مضمون اور طرزِ بیان میں اس کے سوا اور کوئی فرق نہیں کہ نثار نے اختصار سے کام لیا ہے۔ مرزا ؎

رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

مولانا راسخ کا ہم رنگ شعر دیکھیے ؎

باندھ کر احرام پی زمزم پہ مے اللہ اللہ پاک دامانی مری

کسی اور شاعر کا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو ؎

خوب پی رات کو مے صبح کو توبہ کر لی رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

یوں تو تینوں شعر اپنی اپنی جگہ خوب ہیں لیکن اس آخری شعر میں شوخی کا رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ راسخ کی پاک دامانی کی داد دیجیے کہ احرام باندھ کر شراب پی لی۔ مرزا نے مے نوشی کے لیے زمزم اور جامۂ احرام کو بھی قابلِ احتیاط نہ سمجھ کر شعر کی رندانہ شان بڑھا دی ہے۔ مرزا داغ نے بھی اس مضمون کا شعر کہا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے

صبح مسجد کو گئے اور شام کو میخانے میں رات کو ہم نے اڑائی صبح استغفار کی

مرزا ؎ چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

مرزا داغ کے اس مشہور مطلع کا مطلب بھی یہی ہے ؎

داغ کی شکل دیکھ کر بولے ایسی صورت کو پیار کون کرے

اس مضمون پر کئی شعرا نے طبع آزمائی کی ہے۔ مومن کا شعر ہے ؎

جب کہا یار سے دکھا صورت ہنس کے بولا کہ دیکھو اپنا منہ

بادشاہ ظفر دیدار کے بدلے بوسہ طلب کرکے اسی انداز میں کہتے ہیں ؎

بوسہ مانگوں تو وہ کہے ہنس کر
اپنے منہ کو اور اس سوال کو دیکھ

اسی مضمون کا ایک شعر عاشق نے بھی کہا ہے ؎

طلبِ بوسہ پہ کس ناز سے کہتا ہے وہ شوخ
آئینہ لے کے ذرا منہ بھی تو اپنا دیکھو

ان اشعار کے ساتھ رند کا یہ شعر بھی دیکھئے ؎

مُنہ پہ مُنہ رکھا تو بولے کیا خوب
پہلے مُنہ اپنا تو بنوائیے آپ

اس سلسلے میں نواب سراج الدین احمد خان سائل دہلوی کا مندرجہ ذیل شعر بھی سامنے رکھنا لطف سے خالی نہ ہوگا جس میں مقابلتہً وسعتِ معنی زیادہ پائی جاتی ہے ؎

حرفِ مطلب سُن کے سائل کا شرارت سے کہا
ان کی صورت، ان کی جرأت، ان کا ارمان دیکھنا

مرزا ؎ خطر ہے رشتۂ اُلفت رگِ گردن نہ ہو جائے
غرورِ دوستی آفت ہے تو دشمن نہ ہو جائے

اس شعر کی شرح مولانا حسرت موہانی نے یوں کی ہے :۔ "رگِ گردن بحالتِ غرور و غیظ پھول جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب کو میری دوستی پر اس درجہ اعتماد اور غرور ہے کہ مجھ کو ڈر ہے کہ کہیں رشتۂ الفت رگِ گردن نہ ہو جائے یعنی محبت مبدل بہ دشمنی نہ ہو جائے۔"

اس مضمون سے مولانا نے اسی نوعیت کا ایک اور مضمون نکال کر مندرجہ ذیل شعر میں قلم بند کیا ہے ؎

حد سے نہ بڑھ چلیں تری غفلت شعاریاں
اس درجہ اعتبارِ تمنا نہ چاہیے

مرزا ؎ عارضِ گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسدؔ
جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

کسی اور شاعر کا ہم مضمون شعر ہے ؎

گلوں کو دیکھ کر رخسارِ جاناں یاد آئیں گے
ہرے ہو جائیں گے داغِ جگر تب کے ساون میں

مرزا ؎ یہ ضد کہ آج نہ آئے اور آئے بن نہ رہے
قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے

اس کے ساتھ مولانا آسیؔ کا شعر بھی دیکھیے ؎

یوں تو آئے گی اجل ایک نہ اک دن آسیؔ مگر آتی شبِ فرقت تو مرے کام آتی

مرزا کہتے ہیں کہ اجل آئے گی تو ضرور مگر اسے یہ ضد ہے کہ آج نہ آئے گی۔ پھر ہمیں قضا سے ازبس شکایت کیوں نہ ہو۔ مولانا آسیؔ کہتے ہیں۔ یوں تو ایک نہ ایک دن موت کا آنا یقینی ہے مگر شبِ فراق میں جب ہم زندگی سے بیزار ہو جاتے ہیں اور مرنا چاہتے ہیں نہیں آتی۔ مرزا ؎

رہے ہے یوں گہ و بیگہ کہ کوئے دوست کو اب اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے کیا کہیے

یعنی رقیب دوست کے کوچے میں وقت بے وقت اس طرح رہتا ہے کہ اب اس گلی کو دشمن کا گھر نہ کہیں تو کیا کہیں۔ مرزا داغؔ نے بھی یہ مضمون باندھا ہے اور خوب باندھا ہے ؎

تمھارا گھر نہیں مہمان ہو گویا کہیں ہے دخل دشمن کا کہیں قبضہ ہے دربان کا

مرزا ؎ وائے واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا
لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

کسی اور شاعر کا ہم مضمون شعر ہے ؎

یاں فکرِ معیشت ہے وہاں دغدغۂ حشر آسودہ گی حرفیست یہاں ہے نہ وہاں ہے

شہیدؔ نے یوں کہا ہے ؎

لحد میں بھی یہ دھڑکا ہے کہ محشر سر پہ آتا ہے نہیں ہے جائے آسائش کہیں سارے زمانے میں

امیرؔ نے بھی یہ مضمون کہا ہے ؎

عدم کو یاں سے تو گھبرا کے اے اجل جاتے وہاں بھی جی جو نہ لگتا کہاں نکل جاتے

امیرؔ کا یہ شعر استاد ذوقؔ کے اس شعر سے زیادہ ملتا جلتا ہے جس کے مقابلے میں مرزا کا مندرجۂ صدر شعر ہم پہلے درج کر چکے ہیں اور وہ یہ ہے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

حضرت عزیز لکھنوی نے مرزا کے اس مضمون سے ایک عمدہ مضمون نکالا ہے ؎

دم نہ لینے پایا تھا میں چھیڑ دی اک داستاں
قبر میں کیا خاک حاصل ہو تن آسانی مجھے

مرزا ؎
وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے
تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

مولانا حالی دوسری صورت اختیار کر کے کہتے ہیں ؎

شبِ وعدہ ہے بارِ عام ان کے در پر
مرے حق میں اک پاسبانی کی صورت

مرزا کے گھر کی دربانی اور مولانا کی پاسبانی کرنے کی وجہ مختلف ہونے سے ان دو بظاہر مماثل شعروں کا مطلب بھی ایک دوسرے سے بہت بعید ہے۔

مرزا ؎
وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کہ غافل تھے
شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہے

مولانا حالی نے اپنے اُستاد کا یہ مضمون بھی دوسرے ڈھنگ سے کہا ہے ؎

دل چاہتا ہے بزمِ طرب میں انہیں مگر
وہ انجمن میں آئے تو پھر انجمن کہاں

یہی رنگ سالک کے اس شعر سے بھی ٹپکتا ہے ؎

وہ زیبِ شبستاں ہوا چاہتا ہے
یہ مجمع پریشاں ہوا چاہتا ہے

مندرجہ بالا تینوں اشعار کا مضمون نیا نہیں بلکہ ایک پیش پا افتادہ مضمون ہے لیکن مرزا نے جس ڈرامائی انداز اور موثر لہجہ میں مصرعِ اول لگا کر شعر میں جان ڈال دی ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔ حالی اور سالک کے شعروں میں ایسی کوئی بات نہیں۔

مرزا ؎
لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے
میرا ذمہ دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

حضرت ظہیر نے یہ مضمون یوں کہا ہے ؎

سو بار ڈھونڈھتی ہوئی آئی چلی گئی
ہم ناتوانیوں سے نہ آئے قضا کے ہاتھ

مرزا ؎
گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

منشی جگت موہن لال رواںؔ کی ایک رباعی میں بھی یہ مضمون وضاحت سے پایا جاتا ہے ؎

برباد ہوائے آرزو رہنے دے | کچھ اور اسیرِ رنگ و بو رہنے دے
گو کھینچ کے لبوں تک آچکی جانِ رواںؔ | ساقی ابھی شیشہ و سبو رہنے دے

مرزا ؎ سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

مرزا داغؔ کے بھی دو شعر اس کے ساتھ دیکھیے ؎

۱۔ جب تک وفا ہو وعدہ پیاں زندگی کہاں | مجھ سے زیادہ عہد ترا استوار ہے
۲۔ موقوف وصلِ یار ہے گویا وصال پر | اک عمر چاہیے کہ تمنا کرے کوئی

مرزا دوست سے کہتے ہیں۔ تیرا وعدہ بڑا صبر آزما یعنی انتظار طلب ہے۔ اس سے ہماری عمر عہدہ برآ نہ ہوئی اور ہم انتظار ہی میں مر گئے۔ تیری تمنا کرنے کا وقت ہی نہ آنے پایا۔ مرزا داغؔ کے دو شعروں میں بھی دوسرے الفاظ میں یہی مفہوم پنہاں ہے

مرزا ؎ کیا کیا خضر نے سکندر سے | اب کسے رہنما کرے کوئی

کسی اور شاعر کا یہ شعر بھی دیکھیے ؎

جنابِ خضر تو خود راستہ بتاتے ہیں | جہاں میں کس کو کرے کس کو رہنما نہ کرے

مرزا ؎ زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے
دیکھیں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

علامہ اقبالؔ مرحوم نے اس مضمون کو اس طرح پہلو بدل کر لکھا ہے کہ اس سے ایک نیا مضمون نکال لیا ہے ؎

ایسی ذلت ہے مرے واسطے عزت سے سوا | خود وہ اٹھ کے مجھے محفل سے اٹھا دیتے ہیں

مرزا ؎ ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہے گا اس کی گردن پر
وہ خوں جو چشمِ تر سے عمر بھر یوں دمبدم نکلے

مرزا داغؔ نے دوسرا پہلو اختیار کر کے اس مضمون پر یوں روشنی ڈالی ہے ؎

بخش دے اس بتِ سفاک کو لے دادرِ حشر | خون ہی مجھ میں نہ تھا خون کا دعوے کیسا

مرزا ؎ نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن

بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

حضرت ارمان دہلوی کے یہاں یہ مضمون یوں آیا ہے ؎

نکالے کیا گئے ان کے مکاں سے زمیں پر آ پڑے ہم آسماں سے

سید محمود علی برتر نے بھی یہ مضمون اپنے ایک شعر میں داخل کیا ہے ؎

ہم آپ کے کوچے سے جو نکلے تو عجب کیا آدم بھی ہوئے خلد کی تعمیر سے باہر

ظاہر ہے کہ ارمان اور برتر کے شعروں کو مرزا کے شعر سے کوئی نسبت نہیں۔ مرزا کا انداز بیان بے بدل ہے۔

مرزا ؎ بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا

اگر اس طرۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

یہ مضمون حضرت بیخود دہلوی نے بھی باندھا ہے اور انصاف یہ ہے کہ خوب باندھا ہے ؎

ناپ لیجے اپنے گیسو کی درازی قد سے آپ اب تو یہ فتنہ قیامت کے برابر ہو گیا

مرزا ؎ محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا

اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

جس کافر پہ دم نکلے یعنی جس کافر کے حسن پر مرتے ہیں۔

مولانا آسی نے یہ مضمون یوں کہا ہے ؎

اُسے مرنا بھی مشکل ہے اُسے جینا بھی مشکل ہے جو تم کو دیکھ کر جیتا ہو اور تم پر ہی مرتا ہو

مضمون مرزا سے مستعار لیا گیا ہے لیکن مولانا کا اسلوب بیان بھی اچھا ہے۔ اسی رنگ میں مولانا کا ایک اور شعر دیکھیے ؎

بھلا پھر لاش اس کی کیوں نہ بے گور و کفن رہتی رہ جاں بخش کا کشتہ نہ زندہ تھا نہ بیجاں تھا

اس شعر کے مضمون کی نوعیت کسی قدر مختلف ہے لیکن اس کا پیرایۂ بیان بھی اچھا ہے۔

مرزا ؎ خدا کے واسطے پردہ نہ کعبے کا اٹھا واعظ

کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے[1]

---

[1] یہ شعر "دیوانِ غالب" کے عام نسخوں میں نہیں پایا جاتا۔ حضرت جوش ملسیانی کے مشرح ایڈیشن

اس کے ساتھ بادشاہ ظفرؔ مرحوم کا شعر بھی ملاحظہ فرمائیے جو مرزا کے شعر سے مختلف نہیں۔ صرف پہلے مصرعے میں ایک دو لفظ آگے پیچھے لائے گئے ہیں۔ عجب نہیں کہ شعر دراصل ظفرؔ کا ہو اور کسی غلط فہمی کی بنا پر غالبؔ سے منسوب کیا گیا ہو ؎

خدا کے واسطے زاہد اٹھا پردہ نہ کعبے کا　　کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

اس مضمون پر بہت سے شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔ امیرؔ مینائی کہتے ہیں ؎

دیر کی تحقیر کراتنی نہ اے شیخ حرم
آج کعبہ بن گیا کل تک یہی بت خانہ تھا

ہمارے ایک پرانے دوست حضرت محی الدین قمرؔ کا یہ شعر دیکھئے ؎

بت پرستی گر نہ ہوتی حق پرستی کا اصول　　کعبہ کہلاتا ہے جواب کیوں کبھی بت خانہ تھا

قمرؔ کا شعر امیرؔ کے شعر سے زیادہ قریب نظر آتا ہے مگر یہ دونوں شعر ظفرؔ ہی کے شعر کا عکس ہیں۔ اسی رنگ میں کسی اور شاعر کا یہ شعر دیکھئے ؎

سنگ اسود ہے حرم میں مجھے ڈر ہے واعظ　　کہیں پڑ جائے نہ بنیاد صنم خانے کی

ان اشعار کے ساتھ زمانہ حال کے کسی اور شاعر کا یہ شعر بھی ملاحظہ کیجئے ؎

زہد کی آستیں ٹٹول دیکھ کہاں صنم نہیں　　سنگ سیاہ ناگزیر ورنہ حرم حرم نہیں

مرزا ؎　　کہاں میخانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

مطلب یہ کہ شراب ایسی شے ہے کہ واعظ بھی چھپ کر پی آتے ہیں۔

اس مضمون نے دوسرے اُستادوں کے یہاں کیا کیا رنگ اختیار کیا ہے اور ان کی جولانیٔ طبع کے سہارے کیا کیا قلابازیاں کھائی ہیں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ مرزا داغؔ نے دل کھول کے اس مضمون کو پہلو بدل بدل کر ادا کیا ہے۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے اور ان کی شوخی اور ظرافت کی چاشنی سے لطف اٹھائیے ؎

۱۔ کہلا رہے ہیں حاتم ثانی جناب شیخ　　کیا جانے مے فروش کو حضرت نے کیا دیا
۲۔ اندیشۂ فردا نہ رہے حضرت زاہد　　میخانے میں پی لیجئے تھوڑی سی اگر آج

۳۔ شیخ جی کے ہاتھ میں پکڑا دی لکڑی رند نے
نشہ بھی تھا اور پیری بھی تھی چلتے کس طرح

۴۔ اے داغ میکدے میں گئے ہیں جنابِ شیخ ٹوٹا ہے آج قبلۂ حاجات کا لحاظ

۵۔ مے خانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ
سب لوگ پوچھتے تھے کہ حضرت ادھر کہاں

۶۔ وہ کترا کے چلے ہیں مے کدے سے حضرتِ واعظ
بڑے مرشد ہیں ہاتھوں ہاتھ لانا اُن کو یاروں میں

۷۔ دیکھنا پیرِ مغاں حضرتِ واعظ تو نہیں کوئی بیٹھا نظر آتا ہے پسِ خم مجھ کو

۸۔ وہ آئی گھٹا جھوم کے للچانے لگا دل واعظ کو بلا دو کہ چلی ہاتھ سے توبہ

۹۔ حضرتِ ناصح لے پی کر یہ اچھی چال کی محتسب سے جا ملے رندوں کے مخبر ہو گئے

۱۰۔ جاتے تھے منہ چھپا کے جو بے میکدے کو ہم آتے ہوئے اُدھر سے کئی پارسا ملے

پہلا، دوسرا، چوتھا، چھٹا، ساتواں، آٹھواں، نواں اور دسواں شعر شیخ، زاہد، پارسا یا واعظ کی تضحیک میں مرزا کے مفہوم شعر کے ساتھ قریب قریب ہم آغوش ہیں۔ تیسرے میں شاعر نے شیخ کو نشہ کی حالت میں لڑکھڑا کر گرنے سے بچانے کے لیے رند کے ہاتھوں اس کی دستگیری کرنے کا جو ذکر کیا ہے اس نے مضمون میں جان ڈال دی ہے۔ پانچویں شعر میں شاعر نے اپنی ہی ذات پر چوٹ کی ہے۔ اس سے مضمون نے بالکل دوسری صورت اختیار کی ہے۔

اس سلسلے میں مجروح کا یہ شعر بھی دیکھئے ؎

درِ مے خانہ یہ رہا مجروح آپ جاتے ہیں اے جناب کہاں!

یہاں شاعر واعظ کے بجائے اپنے آپ سے مخاطب ہو کر اسی مطلب کو ادا کرتا ہے پھر شیخ صاحب سے بھی مخاطب ہو کر کہتا ہے ؎

ہونٹ ہی چاٹتے رہ جاؤ گے گر چکھ لو گے شیخ صاحب ہے بہت بادۂ گلفام لذیذ

خمریات کے بادشاہ حضرت ریاض خیر آبادی کے بھی ایک دو شعر سنیئے ؎

۱۔ اُتر گئی سرِ بازار شیخ کی پگڑی ‏ ‏ گرہ میں دام نہ ہوں گے اُدھار پی ہو گی

۲۔ شیخ جی گر گئے بھٹے حوض میں میخانے کے ‏ ‏ ڈوب کر چشمۂ کوثر کے کنارے نکلے

امیر کہتے ہیں ؎

۱۔ کہئے جو چاہئے مسجد میں جنابِ واعظ ‏ ‏ آپ سے ہم سے تو میخانے میں حضرت ہو گی

۲۔ شیخ جی چھپ کے یہ حجرے میں اڑانا بوتل ‏ ‏ واہ واہ آج تو حضرت تمہیں ہم مان گئے

تسلیم کا شعر ہے ؎

آپ آئیں میکدے میں خیر ہے ‏ ‏ شیخ صاحب وہ نشیں کیا ہوا

حضرتِ آغا شاعر دہلوی کا شعر مرزا کے شعر سے بلحاظِ مضمون و طرزِ ادا بہت قریب ہے ؎

شیخ کو جو پارسا کہتا ہے اس کو کیا کہوں ‏ ‏ میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا وہ میخانے میں تھا

مولانا راسخ نے بھی مختلف صورتوں میں اس مضمون پر طبع آزمائی کی ہے ؎

۱۔ واعظ اب شیخ کو بلاؤں گا ‏ ‏ ہو چکا ہوں جناب سے فارغ

۲۔ میخانے کی ہوا بھی بُری ہے جنابِ شیخ ‏ ‏ دیکھو وہ لڑکھڑائے وہ بہکے حضور پاؤں

۳۔ کس نے میخانے سے واعظ کو یہ کہہ کر روکا ‏ ‏ ٹھہر او مردِ مسلمان کہاں جاتا ہے

۴۔ خُم کے خُم پی کے بھی ہم نے تو نہ دیکھا زاہد ‏ ‏ کس طرح جاتا ہے ایمان کہاں جاتا ہے

اب حضرت جلیل کے ایک دو شعر دیکھئے ؎

۱۔ تجھے ہے ذکر مے اب چین ہی آنا نہیں واعظ
مری نیت تو نیتی ہی آفریں ہے تیری نیت پر

۲۔ ساقی شراب خانے میں آئے ہیں آج شیخ ‏ ‏ لانا ذرا مزے کی مرے یار کے لئے

حضرت سائل دہلوی کا بھی یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

یہ مسجد ہے یہ میخانہ تعجب اس پہ آتا ہے ‏ ‏ جنابِ شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

مسرور کا شعر سُنیئے ؎

پارسائی کی بہت لیتا تھا شیخ ‏ ‏ ایک ہی چلو میں اوندھا کر دیا

مولوی عبدالحکیم بسمل کا یہ شعر بھی لطف سے خالی نہیں ؎

شیخ مے کو بُرا بتاتے ہو	اس کا تم کو مزہ چکھائیں گے

سرؔوش ملیح آبادی کا انداز دیکھئے ؎

واعظ کو جو میکدے میں پیتے دیکھا	میں نے کہا آداب بجا لاتا ہوں

اس کے ساتھ حضرت مضطرؔ کا ایک شعر بھی یاد آ گیا ہے جو مضمون اور طرزِ ادا کے اعتبار سے سرؔوش کے شعر سے بالکل ہم آہنگ ہے لگے ہاتھوں یہ بھی سُنتے چلیے ؎

رات نکلے جو مے کدے سے شیخ	میں نے جھک کر وہیں سلام کیا

مرزا ؎	تپِش آپڑی ہے وعدۂ دل دار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

اس کے ساتھ مولانا آسیؔ کا یہ شعر بھی پڑھیئے ؎

یہ مانا وعدہ خلافی کے آپ عادی ہیں	میں کیا کروں کہ مجھے انتظار رہتا ہے

اس مضمون پر حضرت فراقؔ گورکھپوری نے بھی دو شعر کہے ہیں ؎

۱ وہ نہ آئیں گے تو فراقؔ ہمیں	کام ہی کیا ہے انتظار کریں

۲ نہ کوئی وعدہ نہ کوئی یقیں نہ کوئی امید	مگر ہمیں تو تیرا انتظار کرنا تھا

عیاں ہے کہ نہ آسیؔ کا اور نہ فراقؔ کا کوئی شعر مرزا کے شعر کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ آسیؔ کی نسبت فراقؔ کے شعروں میں ایک قسم کا تیکھاپن پایا جاتا ہے۔

مرزا ؎	آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

یعنی میں ایسا حسین کہاں سے لاؤں جسے لوگ تجھ سا کہیں۔ بہتر یہ ہے کہ میں تجھے آئینہ دوں کہ اس میں تو اپنا عکس دیکھ کر حیران ہو جائے اور یہ لوگوں کے لیے ایک تماشا بن جائے۔ یہ مضمون حضرت عزیزؔ لکھنوی کے یہاں بھی جلوہ گر ہے مگر دوسرے اسلوب سے

؎ آئینہ رکھ کے دیکھو تماشا کہیں جسے	تو ہی تو خود ہے وہ بھی کہ تجھ سا کہیں جسے

مرزا ؎	اے پرتوِ خورشیدِ جہانتاب ادھر بھی
سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

مولانا حالیؔ اسی انداز میں اپنی نظم "عرض حال بجناب رسول صلعم" کے پہلے مصرعے میں حسبِ ضرورت تھوڑی سی تبدیلی کر کے کہتے ہیں ؎

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے امت پہ تیری آ کے عجب وقت پڑا ہے

مرزا ؎ زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرم سے

آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے

اس کے ساتھ حضرت ریاضؔ خیرآبادی کا یہ پھڑکتا ہوا شعر بھی ملاحظہ فرمایئے ؎

دھونا ہے داغِ جامۂ احرام صبح صبح حجرے سے شیخ پانی کی چھاگل اٹھا تو لا

مرزا کا جامۂ احرام زمزم پر شراب پینے سے آلودہ ہو گیا ہے اس لیے وہیں ٹھہرنا چاہتے ہیں تاکہ جامۂ احرام آبِ زمزم سے پاک کرلیں۔ طوفِ کعبہ کی نوبت کہاں آئے گی؟ ریاضؔ کی شوخی دیکھئے وہ رات کو کعبہ ہی میں شراب پی چکے ہیں اور صبح کو جامۂ احرام کے دھبے دھونے کے لیے شیخ سے پانی کی چھاگل، مانگ رہے ہیں۔

مرزا ؎ گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی

اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

مولانا راسخؔ نے یہ مضمون اس طرح ادا کرنے کی کوشش کی ہے ؎

دیا تھا پاسباں کو اُن کے دھوکا میں نے سائل کا ، مری شامت مری منت سماجت ہو گئی مانع

مرزا کا شعر نہایت بلیغ ہے اور اس کی بندش لاجواب۔ راسخؔ کا شعر محض اس کا بھونڈا چربہ ہے۔

مرزا کے کلام میں تکرار

اب ہم ان اشعار کا ذکر کریں گے جن میں مرزا کے یہاں مختلف صورتوں میں تکرار پائی جاتی ہے۔ اصطلاحِ شعراء میں اسے "تمغا" کہتے ہیں۔ محققین کے نزدیک اس میں کچھ مضائقہ نہیں بشرطیکہ مضمون کو مکرر باندھنے کی کوئی ایسی وجہ ہو جو اس کو حق بجانب ٹھہرائے مثلاً اس میں توسیعِ معنی کی کوئی صورت پیدا کی گئی ہو یا خیال کا کوئی نیا پہلو یا گوشہ نکالا گیا ہو یا کسی اچھوتی تشبیہ یا نادر استعارے کے پردے میں پہلے سے زیادہ دلکش انداز میں ادا کیا گیا ہو۔ غرض اس میں مزید کسی خوبی کا اضافہ کیا گیا ہو ورنہ تکرارِ مضمون نہ صرف بے معنی اور معیوب ہے بلکہ بے لطفی اور بدمزگی کا باعث ہوتی ہے اور سچ پوچھئے تو مضمون مبتذل ہو جاتا ہے۔ کشمیر کے مشہور فارسی شاعر مُلّا طاہر غنی نے بجا فرمایا ہے ؎

در مکرر بستنِ مضمونِ رنگیں لطف نیست

کم دہد رنگ ار کسے بندد حنائے بستہ را

عام طور پر تکرار کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ شاعر کی قوتِ متخیلہ محدود ہوتی ہے اور اس لیے وہ عجزِ طبع سے مجبور ہو کر ایک ہی خیال کو کئی اشعار میں دہراتا ہے۔ معنی کے اعتبار سے ایسے ہم مضمون اشعار میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ وہ مختلف بحور و قوافی اختیار کر کے دوسرے الفاظ میں وہی مطلب ادا کرتا ہے۔ چوں کہ اس طرح وہ محض مضمون کا اعادہ کرنے سے آگے بڑھنے نہیں پاتا ایسی تکرار بارِ خاطر ہوتی ہے۔ فصحا اور

بلند پایہ شعرا اس سے احتراز کرتے ہیں۔ مرزا کی معنی یاب طبیعت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ عام طور پر ایسی تکرار سے دامن بچاتے ہیں۔ ان کے تمام دیوان میں اس قسم کے اشعار کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔

تکرار کی دوسری صورت یہ ہے کہ شاعر عمداً و قصداً اپنے کسی کہے ہوئے مضمون کو دوبارہ پیش کرتا ہے۔ اس کے دو سبب ہوتے ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ ایک ہی خیال یا مضمون کو اس وجہ سے ایک ہی دفعہ شعر میں باندھنے پر قانع نہیں رہتا کہ یہ اسے مرغوبِ خاطر ہوتا ہے۔ دوبارہ دل کھول کے بیان کرنا چاہتا ہے اور اس لیئے کہ اس بحر میں جس میں کہ وہ پہلی دفعہ شعر کہتا ہے حسبِ منشا روسیع المعنی الفاظ و تراکیب سمونے میں ناکام رہتا ہے دوسری دفعہ دوسری زبن میں زیادہ موثر اور دلنشین پیرایہ میں مکمل طور پر ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے یہاں تک کہ اس کی طبیعت بھر جاتی ہے اور اسے اطمینان ہو جاتا ہے کہ اس کا مطلب بوجہ احسن واضح ہو گیا اور اس میں استادانہ اندازِ بیان کا رنگ آیا۔ ایسی تکرار طبیعت پر گراں نہیں گزرتی کیوں کہ اس صورت میں مضمون نظرِ ثانی کے بعد بہتر قالب میں ڈھالا جاتا ہے اور حسبِ ضرورت الفاظ کے حسنِ انتخاب سے ادائے مطالب کی صحیح تصویر کا نمونہ جلوہ گر کرتا ہے۔ دوسرا سبب یہ ہوتا ہے کہ شاعر ایک دفعہ کہے ہوئے مضمون میں ایک اور گوشہ نکالنا چاہتا ہے یا اسے دوسرے رخ سے بیان کرنا زیادہ پسند کرتا ہے یا کچھ رد و بدل کر کے مضمون کو بلند کر دیتا ہے جس سے خیال کی ایک نئی صورت وجود میں آتی ہے۔ غرض ایک قادر الکلام شاعر ایک ہی مضمون کو نئے لباس میں اس طرح ہمارے سامنے رکھ دیتا ہے کہ ذرا سے لفظی تغیر سے وہ مضمون دو سانچوں میں ڈھل کر دو مضمونوں کی صورت اختیار کرتا ہے اور ان میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے حالاں کہ بنائے خیال ایک ہی ہوتی ہے۔ اس قسم کی تکرار کو شاعر کے عجزِ طبع پر محمول نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس وجہ سے کہ اس میں کسی حد تک شاعر مزید قوتِ متخیلہ سے کام لیتا ہے ایسی تکرار تازہ تخلیق سے کم درجے کی نہیں ہوتی۔ مرزا کے مختصر سے مجموعۂ کلام میں اس نوعیت کے اشعار خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ ان میں سے بیشتر ایسے بھی ہیں جن میں انہوں نے اپنی بہار

آفریں طبیعت سے گلہائے رنگ رنگ کا چمن اس طرح کھلا دیا ہے کہ اس کے خوش آیند پیکروں سے لطف اندوز ہو کر ان کی قابلِ رشک دماغی صلاحیت، ذہنی نشوونما اور خداداد قابلیت کا نہ صرف قائل ہونا پڑتا ہے بلکہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ لیجئے اب مرزا کے وہ اشعار بھی ملاحظہ کیجیے جو اس طرز کے حامل ہیں اور ان کے قندِ مکرر کی چاشنی سے لذّت یاب ہو جئے۔

مرزا کے ابتدائی دورِ کلام پر جو بادی النظر میں عام لوگوں کی فہم سے بالاتر تھا ان کے اکثر ہم عصر ہنسی اڑایا کرتے تھے۔ مرزا نے ان معترضوں کی نکتہ چینی اور تضحیک کے جواب میں کئی اشعار کہے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے کس کس انداز سے ایک ہی مطلب کو مختلف پہلوؤں میں بیان کرتے ہیں۔

(ا)

(ا) آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے مدّعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

مطلب یہ کہ عقل و فہم میری تقریر کو سمجھنے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کریں میرے مفہوم تک ان کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ یعنی میرے اشعار سراسر اسرار ہیں۔

(ب) ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

کہتے ہیں۔ ہمارے شعر محض دل لگی کا سامان ہیں۔ لوگ نہ ہمارے اشعار کو سمجھتے ہیں۔ نہ قدر دان ہیں معلوم ہو گیا کہ ہنر کے ظاہر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

(ج) گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

مطلب یہ کہ اگر خاموشی سے یہ فائدہ ہے کہ حالِ دل پوشیدہ رہے تو میں خوش ہوں کہ میری بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی یعنی اس طرح مجھے وہی فائدہ حاصل ہوتا ہے جو خاموش رہنے میں ہے۔

(د) نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

یعنی اگر لوگ میرے اشعار کو بے معنی قرار دیتے ہیں تو دیں۔ مجھے اس کی پروا نہیں۔ مجھے کسی سے داد ملنے کی تمنا نہیں اور نہ صلے کی پروا کرتا ہوں۔

(ط) بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

کہتے ہیں۔ نہ معلوم جوشِ وحشت میں کیا کچھ بک جاتا ہوں۔ خدا کرے کوئی کچھ نہ سمجھے۔

اب اخیر میں اس مضمون پر ذیل کی رباعی ملاحظہ فرمایئے ؎

(ی) مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

مولانا حالی اس رباعی کا مطلب یوں لکھتے ہیں :۔ اس اخیر کے مصرعے میں دو معنی پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر ان کی فرمائش کی تعمیل کروں اور آسان شعر کہوں تو یہ مشکل ہے کہ اپنی طبیعت کے اقتضا کے خلاف ہے اور آسان نہ کہوں تو یہ مشکل ہے کہ وہ بُرا مانتے ہیں اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ اس باب میں صاف صاف بات کہتا ہوں تو سخنورانِ کابل کی نافہمی و کُند ذہنی ظاہر کرنی پڑتی ہے اور صاف صاف نہ کہوں تو آپ ملزم ٹھہرتا ہوں۔

ظاہر ہے کہ مندرجۂ صدر تمام اشعار کی تہ میں بنیادی خیال یہ ہے کہ لوگ ان کے کلام کو ادق بلکہ بے معنی کہتے تھے لیکن وہ اس کی پروا نہ کرتے تھے اور ان کی نکتہ چینی سے بے نیاز تھے کیوں کہ وہ بہ اقتضائے طبیعت اپنی روش کو ترک نہیں کر سکتے تھے۔ اور اُن کے نزدیک شعر بے معنی نہیں ہوتے تھے۔

(۲)

(ﻻ) تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

یعنی فرہاد مرنے کے لیے بھی رسم و راہ کا پابند رہا۔ جب تیشہ سے سر پھوڑا تو کہیں مرا اس کا جذبۂ عشق کامل ہوتا تو بغیر سر پھوڑے ایک آہ کھینچ کر مر گیا ہوتا۔

(ب) کوہکن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسدؔ
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

کہتے ہیں کہ کوہکن یعنی فرہاد فقط شیریں کی تصویر بنانے والا نقاش تھا۔ عاشقِ صادق

نہ تھا ورنہ یہ ناممکن تھا کہ پتھر سے سر مارتا اور اس میں سے معشوق نہ نکل آتا۔

(ج) عشق و مزدوریٔ عشرت گہِ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامیٔ فرہاد نہیں

مطلب یہ کہ فرہاد عاشقی کا دم بھرے اور پھر خسرو یعنی اپنے رقیب کا محل تعمیر ہونے پر مزدوری کرے۔ یہ ذلت گوارا کرنا شانِ عشق کے خلاف ہے۔ سچا عاشق ہوتا تو یہ ذلت گوارا نہ کرتا۔ ان تینوں شعروں کا مضمون دراصل ایک ہے اور وہ یہ کہ مرزا کے نزدیک فرہاد عاشقِ صادق نہ تھا لیکن ہر شعر میں بیان کا عالم جدا ہے۔ یہ مرزا کی جدّت آفریں طبیعت کا کرشمہ ہے کہ ایک ہی بات کو نئے رنگ، نئے انداز اور دوسرے الفاظ میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اشعار ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں اور بظاہر تکرارِ مضمون کا گماں نہیں ہوتا۔

فارسی میں بھی مرزا نے یہ مضمون کہا ہے ؎

(د) از جوئے شیر و عشرتِ خسرو نشاں نماند — غیرت ہنوز طعنہ بہ فرہاد می زند[1]

فارسی کے ایک اور شعر میں بھی اسی مضمون کی صدائے بازگشت سُنائی دیتی ہے ؎

(ہ) ترا بہ حربہ چہ حاجت نہ آں بود غالبؔ — کہ جاں بہ لذتِ آویزشِ دروں ندہد[2]

(۳)

(ا) غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل — خوں کیا ہوا دیکھا گُم کیا ہوا پایا

(ب) اس کے ساتھ ان کا یہ شعر بھی دیکھیے ؎

پھر جگر کھودنے لگا ناخن
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

دونوں شعروں میں فصلِ بہار کی آمد پر جوشِ جنوں تازہ ہو جانے کا مضمون ہے اگرچہ طرزِ ادا کا پہلو کسی قدر بدل دینے سے معنی میں بظاہر کچھ فرق معلوم ہوتا ہے۔

---

[1] کلیاتِ فارسی۔ ص۔ ۳۴۴ [2] کلیاتِ فارسی۔ ص۔ ۱۵۴۔

مولانا آسی کہتے ہیں کہ اسی مضمون کو تھوڑے تغیر کے ساتھ مصنّف نے کئی جگہ ادا کیا ہے منجملہ ان کے ایک یہ کہ ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

لیکن ہماری رائے میں یہ مضمون بالکل مختلف ہے۔

(۴)

(ا) دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کروں کیا کار فرما جل گیا

اسی مضمون کو دوسرے پہلو سے یوں بیان کرتے ہیں ؎

(ب) دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

پہلے شعر میں کہتے ہیں کہ ان کا دل داغوں کے چراغوں سے جل چکا ہے ورنہ وہ ان داغوں کی بہار دکھاتے اور دوسرے میں یہ کہ ان کے ہر داغِ دل کو جو سروِ چراغاں کا تخم ہے اگر پھلنے پھولنے کا موقع ملے تو وہ اس کی بہار دکھائینگے۔

(۵)

(ا) میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

فارسی میں اس کا متبادل مضمون یوں کہا ہے ؎

(ب) گر دہم شرحِ ستمہائے عزیزاں غالبؔ رسم امید ہمانا زجہاں برخیزد[۱]

اُردو شعر میں اہلِ دنیا کے ظاہری تپاک کی شکایت کرتے ہیں اور فارسی شعر میں اس شکایت کو ستمہائے عزیزاں تک محدود کرکے ناامیدی کا اظہار کرتے ہیں۔ نوعیتِ مضمون ایک ہے۔

---

[۱] کلیات فارسی۔ ص۔ ۴۲۷۔

(۶)

(ا) زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب — تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا

یعنی زخمِ تیر سے بھی تنگیٔ دل کی شکایت رفع نہ ہوئی۔ مرزا نے خود لکھا ہے۔ یہ ایک بات میں نے اپنی طبیعت سے نکالی ہے جیساکہ اس شعر میں ؎

(ب) نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں — وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے

یعنی زخمِ تیر کی توہین بسبب ایک رخنہ ہونے اور تلوار کے زخم کی تحسین بسبب ایک طاق سا کھل جانے کے۔ یہ مضمون بھی فارسی میں یوں کہا ہے ؎

(ج) سرت گردم بزن تیغ و درے بر روئے دل بکشا
دلم تنگ است کار از زخمِ پیکاں بر نمے آید[1]

(۷)

(ا) احباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے — زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

یہی مضمون ذیل کے شعر میں بھی آیا ہے ؎

(ب) مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں — ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

دونوں شعروں کا مفہوم ایک ہے یعنی زنداں میں قید کیے جانے پر یا پاؤں میں زنجیر ڈالنے سے ان کی وحشت کم نہ ہوئی اور ان کا خیال بدستور بیاباں نورد رہا۔

(۸)

(ا) ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریٔ قاتل — کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

بالکل اسی مضمون کا ایک اور شعر یہ ہے ؎

(ب) انہیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا — اٹھے تھے سیرِ گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

دونوں شعروں میں محبوب کے سیرِ گل کا اشتیاق ظاہر کیا گیا ہے جس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ دراصل وہ سیرِ گل کا خواہاں نہیں بلکہ خون میں لتھڑے ہوئے

---

[1] کلیاتِ فارسی۔ ص۔ ۴۲۷۔

بسملوں یا زخمیوں کا تماشا دیکھنا چاہتا ہے۔ ان دو شعروں میں مضمون کے لحاظ سے صرف تھوڑا سا فرق ہے اور وہ یہ کہ پہلے شعر میں ستمگر کی خواہش محبوب کی بے مہری کا ثبوت ہے اور دوسرے میں اسے بہانے کی شوخی کہا ہے ۔

(۹)

(الف) میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

مرزا نے اسی غزل میں ایک اور شعر خفیف سے فرق کے ساتھ اسی مضمون کا کہا ہے ؎

(ب) کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجئے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

دونوں شعروں میں مرجانے کی تمنّا کا اظہار ہے البتہ پہلا شعر زیادہ بلیغ ہے اس میں موت جیسی ناگزیر چیز کو دوستِ ستم گر کی مرضی کے تابع بتایا گیا ہے اور دوسرے میں موت کے نہ آنے کو محرومیٔ قسمت سے تعبیر کیا گیا ہے ۔

(۱۰)

(الف) ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی
گوش منت کشِ گلبانگِ تسلّی نہ ہوا

(ب) درد منّت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

(ج) رنجِ نومیدیٔ جاوید گوارا رہیو — خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں

(د) دیوار بارِ منّتِ مزدور سے ہے خم — اے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے

پہلے شعر میں کہتے ہیں کہ وہ محبوب کے وعدہ نہ کرنے پر اس لیے خوش ہیں کہ کان کو آوازِ تسلّی کا احسان مند نہ ہونا پڑا۔ دوسرے شعر کا مطلب یہ ہے کہ اگر مرض لاعلاج ہونے کی وجہ سے وہ تندرست نہ ہوئے تو کوئی ہرج نہیں کیوں کہ ان کا درد دوا کے احسان سے بچ گیا۔ تیسرے شعر میں دائمی ناامیدی کا گوارا

ہونے کی دعا اس واسطے کرتے ہیں کہ ایسی حالت میں نالہ کو تاثیر کی ذلتِ احسان اٹھانے کی ضرورت نہ ہوگی اور چوتھے میں یہ کہتے ہیں کہ دیوار کے خم ہونے کی وجہ صرف مزدور کا بارِ احساں ہے اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے اور کسی کا احسان نہ اٹھانا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ ان چاروں شعروں میں مضمون کی بنا ایک ہی خیال پر ہے یعنی کسی کا احسان اٹھانا بُرا ہے۔ دیکھئے اس مضمون کو اس طرح پہلو بدل بدل کر لکھا ہے کہ ہر بار اس کی صورت مختلف نظر آتی ہے۔

(۱۱)

(الف) ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

(ب) ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

پہلے شعر میں بہشت کو ایک فراموش کیا ہوا گلدستہ قرار دے کر اس کی تحقیر کرتے ہیں۔ دوسرے میں کہتے ہیں کہ یہ نافہموں کو بہلانے کے لیے ایک سبز باغ دکھایا ہے۔ دونوں صورتوں میں مقصودِ کلام یہ ہے کہ جنّت کی حقیقت کچھ نہیں۔ فارسی میں بھی یہ مضمون کہا ہے ؎

(ج) فردوس جوئے عمر بوسواس دادہ آہ — سرمایہ نیز در ہوسِ سود می رود[1]
(د) غالب خوش است فرصتِ موہوم فکرِ عیش — تا رے کہ نیست در سرِ ایں بود می رود[2]

(۱۲)

(الف) مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولےٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

ذیل کا شعر بھی تھوڑے سے تغیر کے ساتھ اسی مضمون کا حامل ہے ؎

(ب) کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے
برقِ خرمنِ راحت خونِ گرم دہقاں ہے

---

[1] و [2] کلیاتِ فارسی۔ ص۔ ۴۴۲

پہلے شعر میں کہتے ہیں کہ دہقان کا خون سخت محنت کرنے سے گرم ہوجاتا ہے۔ یہی گرمیٔ خون خرمن پر گرنے والی بجلی کا مادہ ہوجاتی ہے یعنی حرارتِ غریزی جس سے انسان زندہ ہے خود وہی وجود کو تحلیل و فنا کر رہی ہے۔ دوسرے شعر میں فرماتے ہیں کہ دہقان کا وہ لہو جو کشت و کار میں گرم ہوتا ہے وہی لالے کے خرمنِ راحت کے لیے برق کا کام دیتا ہے۔ دہقان کی سرگرمی سے لالے کو صرف داغ حاصل ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ ہر تعمیر میں تخریب کا سامان موجود ہے۔

(۱۳)

(ا) اُگا ہے گھر میں ہر سُو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

یعنی گھر میں ویرانی کا یہ عالم ہے کہ چاروں طرف سبزۂ بیگانہ اُگ آیا ہے۔" اب یہ درباں کا کام ہے کہ بیگانہ کو گھر کے اندر سے نکال دے۔" (طبا طبائی)

(ب) ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غم کدہ
جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

مطلب یہ کہ غم کدہ مدّتوں غیر آباد رہا۔ اس وجہ سے سبزہ اُگ آنے سے اس میں بہار آ گئی۔ جس گھر کی بہار ایسی ہو خیال کیجئے اس کی خزاں کس قیامت کی ہوگی۔

(ج) اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالبؔ
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

مفہوم یہ ہے کہ بیاباں نوردی میں اتنی مدّت گزری کہ گھر ویران ہوگیا یہاں تک کہ اس کے در و دیوار پر سبزہ اُگ آنے سے اس میں بہار آئی ہے۔ اب اس کے دیکھنے کے لیے جی لوٹ رہا ہے۔ تینوں شعروں میں ویرانی کے سبب سے سبزہ اُگ آنے کا مضمون باندھا گیا ہے۔

(۱۴)

(ا) محبّت تھی چمن سے لیکن اب یہ بیدماغی ہے
کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

خفیف سے فرق کے ساتھ ذیل کے شعر میں بھی یہی مضمون پایا جاتا ہے ؎

(ب) غم فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو　　مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

دونوں شعروں میں، چمن یا سیرِ باغ سے بیزاری کا مضمون مشترک ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے شعر میں اس کی وجہ بیدماغی بتاتے ہیں اور دوسرے میں غم فراق۔

(۱۵)

(الف)　گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا

جیسا کہ مولانا آسی فرماتے ہیں اسی مضمون کو دوسرا لباس یوں پہنایا ہے ؎

(ب) وعدۂ سیرِ گلستاں ہے خوشا طالعِ شوق　　مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں

پہلے شعر میں کہتے ہیں کہ دوست ہاتھ میں نشتر لئے ہوئے آتا ہے اور از راہِ غمخواری فصد کھول کر میرے جنوں کے علاج کرنے کا ارادہ ظاہر کرتا ہے لیکن اس نے مجھے قتل کرنے کے لئے آستیں میں چھری چھپا رکھی ہے۔ میں فریب نہیں کھا سکتا۔ دوسرے میں فرماتے ہیں کہ دوست نے میرے ساتھ سیرِ گلستاں کا وعدہ کیا ہے۔ یہ میرے شوق کی بڑی خوش نصیبی ہے لیکن اس کے تماشائے لالہ و گل کے وعدے سے میں سمجھ گیا کہ مجھے قتل کریگا یعنی میرا خون بہا کر لالہ و گل کھلا دے گا۔ اس وعدے میں مژدۂ قتل مقدر ہے جس کا اس نے ذکر نہیں کیا ہے۔

(۱۶)

(الف) مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے　　خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

اس کے ساتھ مرزا کا ایک اور شعر دیکھئے جو اسی مضمون کا ہے ؎

(ب) نہ پوچھ بیخودیٔ عیشِ مقدمِ سیلاب　　کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

دونوں شعروں کا مضمون یہ ہے کہ عاشق کو اپنی خانہ ویرانی میں بے حد لطف آتا ہے۔ صرف اندازِ بیان کا فرق ہے۔

(۱۷)

(الف) عشرتِ قتلگہِ اہل تمنا مت پوچھ　　[illegible]

پہلے شعر میں کہتے ہیں کہ دہقان کا خون سخت محنت کرنے سے گرم ہو جاتا ہے۔ یہی گرمیٔ خون خرمن پر گرنے والی بجلی کا مادّہ ہو جاتی ہے یعنی حرارتِ غریزی جس سے انسان زندہ ہے خود ہی وجود کو تحلیل و فنا کر رہی ہے۔ دوسرے شعر میں فرماتے ہیں کہ دہقان کا وہ لہو جو کشت و کار میں گرم ہوتا ہے وہی لالے کے خرمنِ راحت کے لیے برق کا کام دیتا ہے۔ دہقان کی سرگرمی سے لالے کو صرف داغ حاصل ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ ہر تعمیر میں تخریب کا سامان موجود ہے۔

(۱۳)

(ا) اُگا ہے گھر میں ہر سُو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

یعنی گھر میں ویرانی کا یہ عالم ہے کہ چاروں طرف سبزۂ بیگانہ اُگ آیا ہے" اب یہ دربان کا کام ہے کہ بیگانہ کو گھر کے اندر سے نکال دے"۔ (طبا طبائی)

(ب) ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غم کدہ
جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

مطلب یہ کہ غم کدہ مدّتوں غیر آباد رہا۔ اس وجہ سے سبزہ اُگ آنے سے اس میں بہار آ گئی۔ جس گھر کی بہار ایسی ہو خیال کیجیے اس کی خزاں کس قیامت کی ہوگی

(ج) اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالبؔ
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

مفہوم یہ ہے کہ بیاباں نوردی میں اتنی مدّت گزری کہ گھر ویران ہو گیا یہاں تک کہ اس کے در و دیوار پر سبزہ اُگ آنے سے اس میں بہار آئی ہے۔ اب اس کے دیکھنے کے لیے جی لوٹ رہا ہے۔ تینوں شعروں میں ویرانی کے سبب سے سبزہ اُگ آنے کا مضمون باندھا گیا ہے۔

(۱۴)

(ا) محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بیدماغی ہے
کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

خفیف سے فرق کے ساتھ ذیل کے شعر میں بھی یہی مضمون پایا جاتا ہے ؎

(ب) غم فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو — مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

دونوں شعروں میں، چمن یا سیرِ باغ سے بیزاری کا مضمون مشترک ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے شعر میں اس کی وجہ بیدماغی بتاتے ہیں اور دوسرے میں غم فراق۔

(۱۵)

(ل) گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا

جیساکہ مولانا آسی فرماتے ہیں اسی مضمون کو دوسرا لباس یوں پہنایا ہے ؎

(ب) وعدۂ سیرِ گلستاں ہے خوشا طالعِ شوق — مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں

پہلے شعر میں کہتے ہیں کہ دوست ہاتھ میں نشتر لئے ہوئے آتا ہے اور ازراہ غمخواری فصد کھول کر میرے جنون کے علاج کرنے کا ارادہ ظاہر کرتا ہے لیکن اس نے مجھے قتل کرنے کے لیے آستیں میں چھری چھپا رکھی ہے۔ میں فریب نہیں کھا سکتا۔ دوسرے میں فرماتے ہیں کہ دوست نے میرے ساتھ سیر گلستاں کا وعدہ کیا ہے۔ یہ میرے شوق کی بڑی خوش نصیبی ہے لیکن اس کے تماشائے لالہ و گل کے وعدے سے میں سمجھ گیا کہ مجھے قتل کریگا یعنی میرا خون بہا کر لالہ و گل کھلا دے گا۔ اس وعدے میں مژدۂ قتل مقدر ہے جس کا اس نے ذکر نہیں کیا ہے۔

(۱۶)

(ل) مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے — خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

اس کے ساتھ مرزا کا ایک اور شعر دیکھیے جو اسی مضمون کا ہے ؎

(ب) نہ پوچھ بیخودیٔ عیشِ مقدمِ سیلاب — کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

دونوں شعروں کا مضمون یہ ہے کہ عاشق کو اپنی خانہ ویرانی میں بے حد لطف آتا ہے۔ صرف اندازِ بیان کا فرق ہے۔

(۱۷)

(ل) عشرتِ قتلگہِ اہلِ تمنا مت پوچھ — عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

اسی مضمون کو دو اور شعروں میں خفیف سی تبدیلی کے ساتھ بالفاظِ دیگر ادا کیا ہے

(ب) مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
پُر گُل خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

(ج) عجب نشاط سے جلاّد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سایہ سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

تینوں شعروں میں محبوب کے ہاتھوں شہید ہونے پر اظہارِ مسرت کا مضمون مشترک ہے۔ صرف اندازِ بیان متفاوت ہے۔

(۱۸)

(ا) میں نے روکا رات غالبؔ کو وگرنہ دیکھتے
اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

کم و بیش اسی مضمون کا حامل ان کا مندرجہ ذیل شعر بھی ہے

(ب) یونہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

پہلے شعر کا مطلب یہ ہے کہ اگر غالبؔ کو رونے سے باز نہ رکھا جاتا تو سیلابِ گریہ آسمان تک بلند ہو جاتا اور دوسرے کا یہ کہ اگر وہ اسی طرح روتے رہیں گے تو سیلابِ اشک سے ساری بستیاں ویران ہو جائیں گی۔ ان دو شعروں کے مضمون میں کچھ خاص فرق نہیں۔ البتہ دوسرا شعر مقابلتہً بلیغ ہے۔

(۱۹)

(ا) ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

مرزا نے یہ مضمون ایک اور شعر میں بھی بیان کیا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ اس میں مطلب کو کچھ بڑھا دیا ہے

(ب) ودیعت خانۂ بیدادِ کاوشہائے مژگاں ہوں
نگینِ نامِ شاہد ہے مرا ہر قطرہ خوں تن میں

اسی مضمون کو دو اور شعروں میں خفیف سی تبدیلی کے ساتھ بالفاظِ دگر ادا کیا ہے ؎

(ب) مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
پُر گُل خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

(ج) عجب نشاط سے جلاّد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سایہ سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

تینوں شعروں میں محبوب کے ہاتھوں شہید ہونے پر اظہارِ مسرّت کا مضمون مشترک ہے۔ صرف اندازِ بیان متفاوت ہے۔

(۱۸)

(ل) میں نے روکا رات غالبؔ کو وگرنہ دیکھتے
اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

کم و بیش اسی مضمون کا حامل ان کا مندرجہ ذیل شعر بھی ہے ؎

(ب) یونہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

پہلے شعر کا مطلب یہ ہے کہ اگر غالبؔ کو رونے سے باز نہ رکھا جاتا تو سیلابِ گریہ آسمان تک بلند ہو جاتا اور دوسرے کا یہ کہ اگر وہ اسی طرح روتے رہیں گے تو سیلابِ اشک سے ساری بستیاں ویران ہو جائیں گی۔ ان دو شعروں کے مضمون میں کچھ خاص فرق نہیں۔ البتہ دوسرا شعر مقابلتہً بلیغ ہے۔

(۱۹)

(ل) ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

مرزا نے یہ مضمون ایک اور شعر میں بھی بیان کیا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ اس میں مطلب کو کچھ بڑھا دیا ہے ؎

(ب) ودیعت خانۂ بیدادِ کاوشہائے مژگاں ہوں
نگینِ نامِ شاہد ہے مرا ہر قطرہ خوں تن میں

پہلے شعر میں کہتے ہیں کہ خونِ جگر مژگانِ یار کی امانت تھی اس لیے اس کے ایک ایک قطرے کا حساب اسی طرح دینا پڑا جس طرح امانت کا حساب دینا پڑتا ہے۔
دوسرے شعر کا مفہوم بھی قریب قریب یہی ہے البتہ اس میں کسی قدر وسعت پیدا کی گئی ہے اور اندازِ بیان ذرا بدل دیا گیا ہے۔ ہر قطرۂ خون کو نگینہ قرار دیا ہے جس پر محبوب نے سوزنِ مژگاں سے اپنا نام کھود دیا ہے۔ اس طرح ہر قطرۂ خوں پر اس کے نام کی مہر لگی ہوئی ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ ان نگینوں کے امانت خانہ ہیں۔

(۲۰)

(ا) پوچھ مت رسوائی اندازِ استغنائے حسن
دست مرہونِ حنا رخسار رہنِ غازہ تھا

ذیل کے شعر میں بھی یہی مضمون ادا کیا گیا ہے ؎

(ب) حسنِ بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے
آئینہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے

پہلے شعر کا مطلب یہ ہے کہ حسن کے استغنا کی رسوائی نہ پوچھیے۔ ہاتھ مہندی کا اور رخسار غازہ کا مرہونِ منت تھا۔ احسان کی یہ زیر باری حسن کی شانِ بے نیازی کے لیے موجبِ رسوائی ہے اور دوسرے میں کہتے ہیں کہ حسن باوجود بے نیاز اور بے پروا ہونے کے جلوہ گری چاہتا ہے اس کے فکر کرنے کا زانو آئینہ ہے جس کو دیکھ کر وہ نئے نئے جلووں کے اختراع کی فکر میں مصروف رہتا ہے۔
دونوں شعروں کا مضمون یہ ہے کہ حسن بے نیاز ہوکر بھی آرائش کا محتاج یا جلوہ گری کا خواہش مند ہے۔ مرزا نے اندازِ بیاں بدل کر اسے دو شعروں میں اس طرح بیان کیا ہے کہ تکرار کی بدمزگی محسوس نہیں ہوتی۔

(۲۱)

(ا) بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

کسی قدر اختصار کے ساتھ دوسری جگہ یوں کہتے ہیں ؎

(ب) تجاہلِ پیشگی سے مدّعا کیا   کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا

معنی کے اعتبار سے ان دو شعروں میں کوئی خاص فرق نہیں۔ صرف الفاظ بدلے ہوئے ہیں۔

(۲۲)

(ا) رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو وہ اگر شرار ہوتا

اس کے ساتھ ان کا یہ شعر بھی ملاحظہ کیجیے ؎

(ب) لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے
ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی

پہلے شعر میں کہتے ہیں کہ غم وہ بلا ہے کہ انسان تو درکنار اگر یہ شرار بن کر پتھر میں پوشیدہ ہوتا تو اس میں سے بھی لہو ٹپکتا۔ دوسرے میں فرماتے ہیں کہ حریر میں شعلہ لپٹا ہوا نہیں رہ سکتا مگر پھر بھی سوزِ غم دل میں چھپا لینے سے یہ آسان ہے مطلب یہ کہ دل حریر سے زیادہ نازک اور سوزِ غم شعلہ سے زیادہ سرکش ہے۔ ان دو شعروں میں بیان کا عالم ایک دوسرے سے اتنا بعید ہے کہ ان کے ہم مضمون ہونے کا گمان نہیں ہوتا حالاں کہ دونوں میں مقصودِ کلام ایک ہے یعنی غم کی شدتِ اثر کا اظہار۔

(۲۳)

(ا) فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے   ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا

یعنی رقیبِ ہوس کار کی محبت شعلۂ خس کی طرح دم بھر سے زیادہ قائم نہیں رہ سکتی۔ اسے ناموسِ وفا کا کیا پاس ہو سکتا ہے۔ یہ مضمون فارسی میں یوں کہا ہے ؎

(ب) من بوفا مردم و رقیب بدر زد   نیمہ لبش انگبیں و نیمہ طبر زد[۱]

یعنی میں جذبۂ وفا کے مارے ثابت قدم رہا اور رقیب اظہارِ بوالہوسی کے

---

[۱] کلیاتِ فارسی۔ ص۔ ۱۸۵۔

بعد غائب ہوا۔ معشوق کے لب گویا آدھے شہد اور آدھے مصری تھے۔ میں شہد کے ساتھ چپکا رہا اور وہ مصری کو چوس کر چلا گیا۔ (ڈاکٹر عبدالحکیم آشر)

(۲۴)

(الف) پئے نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا — بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا

یعنی درگاہِ کریم تک میری نارسائی کی شرم اس دعوئے پرہیز گاری کا تحفہ معذرت کے لئے پیش کرتی ہے جس کا سینکڑوں قسم کے گناہوں کے ہاتھوں خون ہو چکا ہے یعنی جو توبہ سو بار ٹوٹ چکی ہے۔

دوسرا پیرایۂ بیان اختیار کر کے اسی مضمون کو ایک اور شعر میں اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

(ب) رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے — شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

مطلب یہ کہ گناہوں کی شرمندگی کی وجہ سے مجھ میں عذرِ گناہ پیش کرنے کی بھی ہمت نہیں۔ کیا عجب کہ رحمتِ کریم میری اس شرمندگی ہی کو عذرِ گناہ سمجھ کر قبول کرے۔

ان دو شعروں میں بنیادی خیال ایک ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلا شعر مقابلتہً بلیغ ہے۔

(۲۵)

(الف) وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

اپنے نفس اور نکہتِ گل دونوں کی علت ایک ہی چیز یعنی فصلِ بہار قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان میں کوئی خاص فرق نہیں۔ ادھر بہار آئی اور ادھر مری رنگیں نوائی شروع ہوئی۔

یہی مضمون زیادہ صاف الفاظ میں دوسرے شعر میں یوں ادا کیا ہے ؎

(ب) ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری واہ واہ
پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزل خوانی مجھے

اس میں فصلِ بہار کی آمد پر اظہارِ مسرت کرتے ہیں جس سے ان کا سودائے

غزل خوانی پھر تازہ ہو گیا ہے۔ مضمون واحد ہے۔ صرف اندازِ بیاں مختلف ہے۔

(۲۶)

(ل) نہ دے نامے کو اتنا طول غالبؔ مختصر لکھ دے
کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستم ہائے جدائی کا

یہی مضمون زیادہ اچھے پیرایہ میں ذرا بڑھا کر ذیل کے شعر میں بھی جلوہ گر ہے؎

(ب) مرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

(۲۷)

(ل) یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

یعنی جانتا ہوں کہ محبوب کی طرف سے جوابِ خط کے آنے کی کوئی امید نہیں مگر خامہ فرسائی کا ذوق مجھے مجبور کرتا ہے کہ برابر خط لکھتا رہوں۔ اس کے ساتھ مرزا کا ایک اور شعر دیکھئے؎

(ب) قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں وہ جو لکھیں گے جواب میں

اس میں بھی کم و بیش مندرجہ صدر شعر کا مضمون مضمر ہے لیکن دوسرے رُخ سے کہتے ہیں جب تک قاصد واپس آئے ایک اور خط لکھ کے رکھوں گا اس لئے کہ میں جانتا ہوں کہ محبوب کا جواب کیا ہو گا یعنی وہ خلافِ مدّعا ہو گا یہ شعر نہایت بلیغ ہے۔

(۲۸)

(ل) دل اس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے
ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

یہ مضمون فارسی میں بھی کہا ہے؎

(ب) بکن ناز و ادا چندیں دلے بستان و جانے ہم دماغِ نازکِ من برنمے تابد تقاضا را[۱]

---

[۱] کلیات فارسی ... ۷۵۶

ان دو شعروں کے مضمون میں زبان کے علاوہ طرزِ ادا میں خفیف سا فرق پایا جاتا ہے ۔ اُردو شعر کے مصرعۂ اول میں کہتے ہیں کہ وہ محبوب کو اس کے نازو ادا سے پہلے ہی دل دے بیٹھے ۔ فارسی شعر کے مصرعۂ اوّل میں بتاتے ہیں کہ اسے ناز و ادا دکھلانے کی ضرورت نہیں ۔ وہ بے شک دل و جان لے لے ۔

(۲۹)

(الف) نہ کہہ کہ گریہ بمقدارِ حسرتِ دل ہے مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا

کہتے ہیں کہ دریا کا جمع و خرچ یعنی حسرتِ دل کا ذخیرہ اور اپنے آنسوؤں کی مقدار میری نظر میں ہے یعنی مجھے ان کا اندازہ ہے مطلب یہ کہ حسرتِ دل زیادہ ہے اور مقدارِ گریہ سے اس کا اندازہ ممکن نہیں ۔ مجھے اور زیادہ رونا چاہیے ۔
اس کے ساتھ مرزا کا یہ شعر بھی پڑھیے ؎

(ب) ہے خونِ جگر جوش میں دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خوں نابہ فشاں اور

یعنی دو آنکھیں کافی نہیں ۔ کاش خون رونے والی کئی آنکھیں ہوتیں تو دل کھول کے روتا ۔

دونوں شعروں میں بکثرت روتے کی تمنّا کا اظہار ہے گو مختلف اندازِ بیاں سے یہ دو شعر بظاہر ہم مضمون نظر نہیں آتے ۔

(۳۰)

(الف) فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسدؔ
جفا میں اس کی ہے اندازِ کار فرما کا

یعنی فلک کو دیکھ کر مجھے معشوق یاد آجاتا ہے کیونکہ وہ بھی ایسا ہی جفاکار ہے اس کے ساتھ مرزا کا یہ دوسرا شعر ملاحظہ کیجیے ؎

(ب) غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اُٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

مطلب یہ کہ غم دنیا سے سر اٹھانے کی فرصت ملے تو آسمان پر نظر پڑ جاتی ہے۔
اس کے جفا پیشہ ہونے کی وجہ سے تو یاد آجاتا ہے اور پھر غم کا سامنا ہو جاتا ہے۔
غرض یہ کہ کسی حالت میں غم سے نجات نہیں۔ اس شعر میں مضمون سے ایک اور
گوشہ نکال کر معنوی پہلو کو وسعت دی ہے۔

(۳۱)

(الف) ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں
وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا

اسی مضمون کا ایک اور شعر بھی دیکھئے ؎

(ب) دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

ان دو شعروں کا مفہوم ایک دوسرے سے مختلف نہیں۔ صرف انداز بیان
میں فرق ہے۔ یہ مرزا کی جدت پسند طبیعت کی خصوصیت ہے کہ ایک ہی مضمون
کو مختلف الفاظ کا لباس پہنا کر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ سرسری نظر میں وہ
ایک ہی مضمون معلوم نہیں ہوتا۔

(۳۲)

(الف) گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا • بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

یعنی گھر رونے کے سبب سے دریا ہو رہا ہے۔ نہ روتے تو صحرا ہوتا۔
مطلب یہ کہ ایسا بد نصیب ہوں کہ ویرانی بہر صورت ہوتی۔
اس سلسلے میں مرزا کے دو اور شعر ملاحظہ ہوں ؎

(ب) غالب کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

مطلب یہ کہ میری کوشش سے کوئی فائدہ متصور نہیں۔ اگر میری کھیتی کو
ٹڈی دل نہیں کھائے گا تو خرمن کو بجلی جلا کر خاک کر دے گی۔

(ج) خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈھے ہے ابھی سے برق خرمن کو

یعنی اگر ابر جو کھیتوں کو شاداب کرتا ہے سو بار بھی میرے کھیت پر آئے تو مجھے کوئی خوشی نہیں ہوگی کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ بجلی ابھی سے میرے خرمن کو ڈھونڈھ رہی ہے تاکہ اسے جلا ڈالے۔

تینوں شعروں کا مضمون یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ وہ حالات کی پیش بندی کریں یا تدبیر و کوشش سے کام لیں یا بظاہر آثارِ شادابی بھی دیکھنے پائیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ انہیں بدنصیبی سے مفر نہیں۔ صرف پہلے شعر کی تمثیل دوسرے اور تیسرے شعر کی تمثیل سے مختلف ہے۔

(۳۳)

(ل) بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

اس کے ساتھ ان کا مندرجہ ذیل شعر بھی دیکھئے ؎

(ب) ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

پہلے شعر کا مصرعۂ اوّل دوسرے شعر کا مصرعۂ ثانی قرار دیا گیا ہے۔ ایک مصرع بدل دینے سے مطلب میں کچھ فرق آگیا ہے پہلے شعر میں عشق کو خللِ دماغ کہہ کر بتاتے ہیں کہ گل بلبل کے کاروبار یا نالہ و فریاد پر ہنس رہے ہیں۔ دوسرے میں اس ہنسی کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ بلبل اس دھوکے میں مری جاتی ہے کہ گل میں وفا و ثبات ہے۔

(۳۴)

(ل) کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

اس مضمون کا دوسرا شعر یہ ہے ؎

(ب) کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے کی بہشت
یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

ان دو شعروں کے اندازِ بیاں میں بڑا فرق ہے لیکن بنیادی خیال ایک ہے

یعنی محبوب کا گھر یا کوچہ بہشت سے بہتر ہے۔

ان دو شعروں کے ساتھ مرزا کا یہ شعر بھی دیکھئے

(ج) سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

یہ شعر بھی مندرجۂ بالا دو شعروں کے مضمون کا حامل ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ اس مضمون کو دوسرے رُخ سے بیان کیا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ بہشت کی جو تعریف کی جاتی ہے وہ سب ٹھیک ہے لیکن یہ تب ہی مجھے منظور ہوگی جب وہاں دیدارِ محبوب حاصل ہوگا۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں یہ مرزا کی جدت آفریں طبیعت کا نتیجہ ہے کہ ایک ہی مضمون کو دو یا تین اشعار میں اس طرح الگ الگ کر دکھاتے ہیں کہ تکرار کا عیب معلوم نہیں ہوتا۔

(۳۵)

(ل) جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

اس کے ساتھ یہ شعر بھی پڑھیئے

(ج) ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

قامت کو قیامت سے تشبیہ دینا عام ہے۔ پہلے شعر میں کہتے ہیں کہ قدِ یار کو دیکھ کر مجھے فتنۂ قیامت کا یقین آ گیا۔ دوسرے میں یہ کہ سروِ قامت قیامت سے ایک قد بھر بڑھا ہوا ہے۔ ایک ہی مضمون سے دو گوشے نکال لئے ہیں۔

(۳۶)

(ل) دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

مرزا کا مندرجۂ ذیل شعر بھی بالکل اسی مضمون کا ہے۔ صرف الفاظ کا لباس جُدا ہے۔

(ب) بقدرِ حسرتِ دل چاہئے ذوقِ معاصی بھی
بھروں یک گوشۂ دامن گر آبِ ہفت دریا ہو

(۳۷)

(د) مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا
کس قدر یارب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

فرماتے ہیں کہ عاشق کے دل میں معشوق کے قدم چومنے کی حسرت اس قدر تھی کہ مرنے کے بعد بھی نہ گئی اس لئے اس کی خاک سے دور دور تک مہندی اُگتی ہے تاکہ معشوق پاؤں میں لگائے اور اس طرح عاشق کو اس کے قدم چومنے کا موقع نصیب ہو۔ یہ مضمون ذرا سی تبدیلی کے ساتھ فارسی میں بھی کہا ہے ؎

(ب) لالہ و گل دمد از طرفِ مزارش پسِ مرگ
تاچہا در دلِ غالبؔ ہوسِ روئے تو بود[1]

ان دو شعروں کے مفہوم میں خفیف سا فرق ہے اور وہ یہ کہ اُردو شعر میں پائے پابوسیٔ معشوق کی حسرت کا بیان ہے اور فارسی شعر میں ہوسِ دیدار کا۔

(۳۸)

(د) بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے
یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

مطلب یہ ہے کہ شش جہت یعنی دنیا جو ایک آئینہ خانہ ہے اس کا دروازہ ناقص و کامل یعنی عقل مند و بے وقوف یا عارف و عامی دونوں کے لیے کھُلا ہے۔ دونوں اس آئینے میں دیکھ رہے ہیں اور اپنی استعداد کے مطابق فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ شش جہت سے عارف کا دل مراد ہو۔ اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ جس طرح آئینہ قبولِ عکس میں کچھ امتیاز نہیں کرتا دلِ عارف بھی بری اور اچھی دونوں کیفیتوں کو قبول کرتا ہے۔ فارسی میں یوں کہا ہے ؎

---

[1] کلیاتِ فارسی۔ ص۔ ۴۲۹۔

(ب) ہر ذرہ محوِ جلوۂ حسنِ یگانہ ایست — گوئی طلسمِ شش جہت آئینہ خانہ ایست[1]

یعنی ہر ذرّہ اس وحدہٗ لاشریک کے حسن کا جلوہ دیکھنے میں محو ہے گویا دنیا ایک آئینہ خانہ ہے جس میں وہ جلوہ گر ہے۔ یہاں مرزا نے مضمون کو دوسرے پہلو سے پیش کیا ہے ۔ ۔

(۳۹)

(ل) رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

کہتے ہیں رشک یہ کہہ رہا ہے کہ محبوب کا غیر سے میل جول ہے اور یہ افسوس کی بات ہے مگر عقل کہتی ہے کہ وہ بے مروّت ہے۔ اس کی سرشت میں وفا کہاں؟ وہ کسی کا دوست نہیں ہو سکتا۔

اب ایک اور ہم آہنگ شعر دیکھیے ؎

(ب) جو منکرِ وفا ہو فریب اس پہ کیا چلے
کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں

یعنی دوست رقیب کے جھوٹ موٹ اظہارِ وفا کے فریب میں نہیں آ سکتا اس لیے اس کے بارے میں معشوق سے بدگماں ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

بنیادی طور پر دونوں شعر ہم مضمون ہیں۔ مختلف طرزِ بیان نے الگ کر دیا ہے۔

(۴۰)

(ل) ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

اس شعر کا مفہوم فارسی میں بھی دوسری صورت سے یوں ادا کیا ہے ؎

(ب) غالبؔ نخورد چرخ فریب از ہزار بار — گفتم بروزگار سخنور چو من بسیست[2]

---

[1] کلیاتِ فارسی۔ ص۔ ۳۸۷۔
[2] کلیاتِ فارسی [illegible] ۳۵[illegible]

(۴۱)

(د) جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا　　کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

یعنی ان کا یہ کہنا کہ پچھلی جفاؤں کی شرمندگی سے وہ مجھے منہ نہیں دکھا سکتے میرے لیے تازہ ستم ہے۔ یہ مضمون ایک اور شعر میں بھی آیا ہے ؎

(ب) کبھی نیکی بھی اس کے دل میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں اپنی کر کے یاد شرما جائے ہے مجھ سے

یعنی کبھی اس کو نیکی کرنے کا خیال بھی آتا ہے تو وہ پچھلی جفاؤں کو یاد کر کے مارے ندامت کے منہ نہیں دکھا سکتا اور یہ بھی میرے لیے خرابی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ دو شعر بالکل ہم مضمون ہیں۔ صرف الفاظ بدلے ہوئے ہیں یہ مضمون فارسی میں بھی کہا ہے مگر دوسرے رخ سے ؎

دلستاناں بجل اند ار چہ جفا نیز کنند　　از وفائے کہ نہ کردند حیا نیز کنند[1]

(۴۲)

(د) رات دن گردش میں ہیں سات آسماں　　ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

یہ مضمون بھی فارسی کے ایک شعر میں لکھا ہے ؎

(ب) ہفت اختر و نہ چرخ خود آخر بچہ کار ند
بر قتلِ من ایں عربدہ با یار روا نیست

"اس کا دوسرا مصرع دھوکے میں ڈالتا ہے کہ یہ مضمون دوسرا ہے مگر نفس مطلب بالکل ایک نکلتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ یہ خیال مکمل ادا ہوا ہے اور اردو میں غیر مکمل ہے" (آسی)

(۴۳)

(د) لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ　　جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

مطلب یہ کہ محبوب ہمارے ساتھ عداوت بھی کرتا تو ہم اسی کو لگاوٹ سمجھتے

---

[1] کلیات فارسی۔ ص۔ ۱۴۴۔

کیوں کہ عداوت میں بھی ایک قسم کا تعلق ہے۔

تین اور شعر دیکھئے ؎

(ب) ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

(ج) وارستہ اس سے ہیں کہ محبّت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

یعنی ہم اس خیال سے آزاد ہیں کہ ہمارے ساتھ تم محبّت کیوں نہیں کرتے۔
اگر تم محبّت نہیں کرتے تو عداوت ہی کرو۔ کچھ تو علاقہ باقی رہے۔

(د) قطع کیجے نہ تعلق ہم سے کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

ان چاروں شعروں کا مضمون ایک ہے یعنی دوست سے کسی نہ کسی صورت میں تعلق قائم رہے خواہ وہ دشمنی ہی کا کیوں نہ ہو لیکن ہر شعر میں نئے انداز سے باندھا ہے۔ تکرار کی قباحت محسوس نہیں ہوتی۔

(۴۴)

(ا) ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ یارب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

یہی مضمون ذیل کے شعر میں بھی جلوہ گر ہے ؎

(ب) خدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا
کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

(۴۵)

(ا) موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا

یہی مضمون دوبارہ اس طرح کہا ہے ؎

(ب) اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسدؔ
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

(۴۶)

(ا) عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

ذیل کے شعر میں بھی یہی مضمون آیا ہے ؎

(ب) قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے

کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

دونوں شعروں میں قطرہ و دریا کی تمثیل پیش کر کے کہتے ہیں کہ جزو کل میں مل کر اگرچہ بظاہر فنا ہو جاتا ہے لیکن درحقیقت مبدء سے جا ملتا ہے اور یہی اس کا عین مقصود ہے۔

(۴۷)

(الف) اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ

اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

بالکل یہی مضمون ذیل کے شعر میں بھی باندھا گیا ہے۔ صرف الفاظ مختلف ہیں ؎

(ب) واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

(۴۸)

(الف) مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب

یار لائے مری بالیں پہ اُسے پر کس وقت

بالکل اسی مضمون کا دوسرا شعر یہ ہے ؎

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے

خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس

عالم نزع کا بیان ہے۔ پہلے شعر میں کہتے ہیں۔ میرے احباب محبوب کو میرے پاس لائے لیکن بے وقت یعنی جب مجھ میں آنکھیں کھول کر دیدار سے بہرہ یاب ہونے کی سکت باقی نہ تھی۔ دوسرے شعر میں محبوب ہی سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں تم اچھے وقت میرے پاس آئے جب انتہائے ضعف سے میری آنکھیں کھولتے ہی کھولتے بند ہو گئیں۔ ان دو شعروں کے مضمون میں کوئی فرق نہیں۔ اندازِ بیان بھی یکساں ہے۔ مصرعۂ اوّل دہرایا گیا ہے۔ جیسا کہ مولانا طبا طبائی فرماتے ہیں۔ شعر اوّل اس زمین میں ایک ہی شعر ہے۔ اس کو نکال ڈالنا چاہئے تھا۔ ایسی

تکرار میں کوئی خوبی نہیں ۔

(۴۹)

(ا) اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر — کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست

یہ مضمون بھی مرزا کو بے حد مرغوب تھا اور اسے انہوں نے پہلو بدل بدل کر لکھا ہے۔

دو اور شعر ملاحظہ ہوں ؎

(ب) جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

(ج) ناکامیٔ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز — تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

پہلے شعر میں اپنے دل سے شوقِ دیدار کو ضبط کرنے کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دوست کا جلوہ دیکھنے کی تاب کون لا سکتا ہے۔ دوسرے میں یہ کہ دوست کو پردے میں مُنہ چھُپانے کی کوئی ضرورت نہیں کیوں کہ اس کا حسن قوتِ نظارہ کو جلا کر رکھ دیتا ہے اور اس لئے اُسے کوئی دیکھ نہیں سکتا۔ تیسرے میں یہ کہ دوست کو کوئی دیکھ نہیں سکتا۔ نگاہ کی ناکامی نظارے کو جلا دینے والی بجلی ہے یعنی نگاہ اس کو دیکھنے کی تاب نہیں رکھتی۔ غرض تینوں شعر ہم مضمون ہیں اور بنیادی خیال یہ ہے کہ تو وہ دوست ایسا نہیں کہ کوئی اُسے دیکھنے کی تاب لا سکے ۔

مولانا آسی بجا فرماتے ہیں کہ مصنف کے اس اندازِ بیان کی تعریف نہیں ہو سکتی ہے کہ ذرا سے تغیر سے مضمون کو بالکل علیحدہ کر دکھاتے ہیں۔ فارسی میں کہتے ہیں[۱]

(د) سوزد زبسکہ تابِ جمالش نقاب را — دانم کہ درمیاں نہ پسندد حجاب را

یہاں مضمون کا پہلو کسی قدر بدل دیا ہے لیکن تابِ جمال کی آتش ناکی کو نظر انداز نہیں کرتے ۔

(۵۰)

(ا) کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن — جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر

---

[۱] کلیاتِ فارسی ۔ ص ۔ ۳۷۰ (طالب)

دوسری جگہ مصنف اسی مضمون کو نئے انداز سے یوں بیان کرتے ہیں ؎

(ب) سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پُرسشِ حال

کہ یوں کہے کہ سرِ رہگذر ہے کیا کہیے

پہلے شعر میں کہتے ہیں کہ محبوب اس وقت پرسشِ حال کرتا ہے جب انتہائے ضعف سے مجھ میں طاقتِ گفتار باقی نہ رہی اور پھر بہانہ یہ کرتا ہے کہ میں کسی کے دل کی بات اس کے ظاہر کئے بغیر کیوں کر جان سکوں۔ دوسرے میں کہتے ہیں کہ وہ جان بوجھ کر بازار میں پرسشِ حال کرتا ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ سرِ راہ لوگوں کے سامنے میں کچھ کہہ نہ سکوں گا۔ دونوں شعروں کے مضمون سے محبوب کی عیّاری اور ستم ظریفی ظاہر ہے۔

(۵۱)

(ا) کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

کہتے ہیں رُخِ یار کا جلوہ دیکھ کر مجھے جل جانا چاہئے تھا لیکن میری طاقتِ دیدار مانع ہوئی۔ اب ایسی طاقتِ دیدار پر مارے رشک کے خود جلا جاتا ہوں۔

انتہائے غیرت کا یہ مضمون مصنف نے ذیل کے شعر میں زیادہ صاف ادا کیا ہے ؎

(ب) دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے

میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

یعنی میری بدقسمتی دیکھیے کہ اگر اُسے دیکھنے کا موقع ملتا ہے تو مجھے اپنے اوپر رشک آتا ہے۔ اس رشک نے مجھے دیدار سے محروم کر دیا۔

ذیل کے دو شعروں میں بھی اسی مضمون کی تکرار پائی جاتی ہے۔ صرف انداز بیان کا فرق ہے ؎

(ج) ہم رشک کو بھی اپنے گوارہ نہیں کرتے مرتے ہیں ولے ان کی تمنّا کرتے

یعنی مرے جاتے ہیں مگر ان کی تمنا نہیں کرتے کیوں کہ تمنّا کریں گے تو اپنے اوپر رشک آئے گا۔

(د) تکلف برطرف نظّارگی میں بھی سہی لیکن
وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے
کہتے ہیں مانا کہ میں بھی اس کے دیکھنے والوں میں شامل ہوں لیکن رشک کی وجہ سے مجھے یہ کب گوارا ہو سکتا ہے کہ اغیار اُسے دیکھیں۔
چاروں شعروں میں انتہائے رشک کا مضمون ہے جو مختلف صورتوں میں باندھا گیا ہے۔

(۵۲)

(ا) کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینہ میں مرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر
یعنی میرا دوست مجھ سے کس قدر بدگمان ہے کہ میرے آئینۂ دل میں جو زنگ لگا ہے اسے وہ کسی طوطی کا عکس سمجھتا ہے جس سے مجھے محبت ہو گئی ہے۔
بدگمانی کا یہ مضمون ذیل کے شعر میں بھی آیا ہے۔ تمثیل البتہ مختلف ہے ؎
(ب) بدگماں ہوتا ہے وہ کافر نہ ہوتا کاشکے
اس قدر ذوقِ نوائے مُرغِ بستانی مجھے
مطلب یہ کہ میں مُرغِ چمن کی آواز سُننے کا شوق رکھتا ہوں لیکن میرا دوست اس شوق کو دیکھ کر یہ سمجھتا ہے کہ یہ اور چیزوں سے بھی عشق رکھتا ہے اور بدگمان ہوتا ہے۔ کاش مجھے یہ شوق نہ ہوتا۔ جیساکہ مولانا طباطبائیؒ فرماتے ہیں یہ بدگمانی تصنع سے خالی نہیں اور یہ مضمون کچھ لطف نہیں رکھتا۔

(۵۳)

(ا) گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر
اس کے ساتھ ان کا یہ شعر بھی دیکھیے: دوسرے پہلو سے اسی مضمون کا عکس ہے ؎
(ب) کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نا ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

(۵۴)

(ل) سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

ایک اور شعر میں خفیف سی تبدیلی کے ساتھ یہی مضمون اس طرح کہتے ہیں ؎

(ب) مر گیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی ہے ہے

بیٹھنا اس کا وہ آ کر تری دیوار کے پاس

(۵۵)

(ل) بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا

قیامت اک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر

مطلب یہ کہ شہیدانِ حسرت دیدار میں اس کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہا ہوگا کہ ان کی خاک جلوۂ ناز کے شوق میں اڑ رہی ہے۔ ان کے لیے قیامت ایک تند و تیز ہوا ہے جو ان کی خاک کو جو پہلے ہی سے شوقِ ناز میں اڑتی پھرتی ہے زیادہ پریشان کر دے گی۔

اس خیال کو فارسی میں یوں نظم کیا ہے ؎

(ب) کفِ خاکیم از ما بر نخیزد جز غبار آنجا

فزوں از صرصرے نبود قیامت خاکساراں را[1]

(۵۶)

(ل) فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا

فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر

کہتے ہیں اگر تو اپنی حقیقت کو دیکھنے کا مشتاق ہے تو فنا ہو جا کیوں کہ خس و خاشاک کا نصیبہ بھٹی ہی میں جا کر چمکتا ہے۔ یہ مضمون فارسی میں بھی کہا ہے ؎

(ب) جلوہ در طالعِ خاشاکِ من افتاد زبوں

شد غلط جادۂ گلخن بہ گلستاں رفتم[2]

---

[1] کلیاتِ فارسی۔ ص۔ ۳۶۷۔ [2] کلیاتِ فارسی۔ ص۔ ۳۰۹۔

یعنی ایک تنکے کی طرح میں اپنے طالع کا فروغ حاصل کرنے کے لیے گلخن میں جانا چاہتا تھا مگر راستہ بھول گیا اور گلخن کے بجائے گلستاں میں چلا گیا اور یہ میرے حق میں بُرا ہوا ۔

(۵۷)

(ا) نے گُلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز ۔ میں ہوں اپنی شکست کی آواز

اس مضمون کو فارسی میں اس طرح باندھا ہے ؎

(ب) دیگر زسازِ بیخودیٔ ما صدا مجوے ۔ آوازے از گسستنِ تارِ خودیم ما[1]

(۵۸)

(ا) دیکھ کر تجھ کو چمن بسکہ نمو کرتا ہے ۔ خود بخود پہنچے ہے گُل گوشۂ دستار کے پاس

اسی مضمون کو فارسی میں اس طرح لکھا ہے ؎

(ب) گر بپائے مست ناگہ از درِ گلزار ما ۔ گُل زبالیدن رسد تا گوشۂ دستارِ ما[2]

(۵۹)

(ا) جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے
اے ناتمامیٔ نفسِ شعلہ بار حیف

یہی مضمون ذیل کے دو شعروں میں بھی باندھا گیا ہے ۔ صرف الفاظ بدل دیئے گئے ہیں ؎

(ب) اس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

(ج) جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں
ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتشبار ہے

(۶۰)

(ا) دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

---

[1] کلیاتِ فارسی ۔ ص ۔ ۳۶۰ ۔ [2] کلیاتِ فارسی ۔ ص ۔ ۳۵۶ ۔

اس سے ملتا جلتا مضمون ذیل کے شعر میں بھی باندھا ہے ؎

(ب) غنچہ تا شگفتنہا برگِ عافیت معلوم باوجودِ دلجمعی خوابِ گل پریشاں ہے

پہلے شعر میں ہر موج کو ایک جال اور سینکڑوں مگرمچھوں کے مونہوں کو جال کے حلقے قرار دیا ہے جس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ عالم میں ہر وقت طوفان برپا ہے۔ نہ معلوم قطرے کے موتی بننے تک کی مدت میں اس پر کیا کیا آفتیں آئیں گی۔ دوسرے شعر میں کہتے ہیں کہ غنچے کے کھل کر پھول بننے تک اس کی آسائش کا سامان ختم ہوجاتا ہے۔ غنچہ سے جمعیتِ دل کی صورت ظاہر ہے اور پھول کی پنکھڑیوں کا بکھرا ہوا ہونا پریشانی کی علامت ہے۔ مطلب یہ کہ دیکھئے اس دارِ بلا میں ساز و برگِ عافیت ممکن ہوتا ہے کہ نہیں۔ یہ دو شعر مضمون کے اعتبار سے بہت کچھ مماثل ہیں۔ صرف مختلف تمثیل سے ان کو الگ کر دکھایا ہے۔

(۶۱)

(ل) آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد

مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

بالکل یہی مضمون مرزا نے مندرجہ ذیل شعر میں دوبارہ زیادہ موثر انداز میں بیان کیا ہے ؎

(ب) ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد

یارب اگر اِن کردہ گناہوں کی سزا ہے

یہ مضمون فارسی کے ایک شعر میں بھی داخل کیا ہے ؎

(ج) اندر آں روز کہ پرسش رود از ہر چہ گزشت

کاش با من سخن از حسرتِ ما نیز کنند[۱]

اور پھر فارسی کی ایک رباعی میں بھی اس کا اعادہ کیا ہے ؎

---

[۱] کلیاتِ فارسی۔ ص۔ ۱۴۴۔

اے آنکہ دہی مایہ کم وخواہش بیش آنروز کہ وقت بازپرس آید پیش
بگزار مرا کہ من خیالے دارم باحسرت عیش ہائے ناکردہ خویش[1]

(۶۲)

(د) تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک
بے اختیار دوڑے ہے گل درقفائے گل

مصرعِ اوّل میں اندازِ بیان ذرا بدل کر فارسی میں یوں کہا ہے ؎

(ب) تا گل برنگ و بوئے کہ ماند کہ درچمن
گل در پس گل آمدہ در جستجوئے گل[2]

(۶۳)

(د) کیا کہوں تاریکیٔ زندانِ غم اندھیر ہے
پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

بالکل یہی مضمون ذیل کے شعر میں دوبارہ جلوہ گر ہے ؎

(ب) بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی
شبِ مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

ان دو شعروں میں خفیف سا فرق یہ ہے کہ پہلے شعر میں روئی کو سفیدی کی بنا پر نورِ صبح اور دوسرے شعر میں شبِ مہ کہا ہے۔

(۶۴)

(د) زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

یہی مضمون ہو بہو ذیل کے شعر میں دوبارہ لکھا ہے۔ صرف الفاظ کا جامہ بدل دیا ہے ؎

(ب) رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی
سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے

---

[1] کلیاتِ فارسی۔ ص۔ ۵۴۶۔ [2] کلیاتِ فارسی۔ ص۔ ۴۸۵۔

یہ مضمون دوسرے انداز سے فارسی میں بھی کہا ہے ؎

(ج) مسکیں خبر از لذتِ آزار نہ دارد　　خارم کن و در رہ گذر پارہ گرم ریز [1]

(۶۵)

(د) ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ　　ہے ہے خدا نہ کردہ تجھے بیوفا کہوں

مطلب یہ کہ میرا گماں تجھے بیوفا کہتا ہے اور میں باوفا کہتا ہوں۔ بیوفائی نہ کر کہ مجھے اپنے گماں سے شرمندہ ہونا پڑے اور خدانخواستہ تجھے بیوفا کہنا پڑے۔
اسی مضمون کی صدائے بازگشت دوسری صورت سے اس شعر میں سنائی دیتی ہے

(ب) ہے ہے خدانخواستہ وہ اور دشمنی
اے شوقِ منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے

یعنی اے شوق تو پشیمان ہو رہا ہے کیوں کہ تیرے خیال میں دوست دشمن نکلا۔ یہ تیرا خیال غلط ہے۔ وہ دشمن نہیں۔ بھلا وہ اور دشمنی! خدا نہ کرے۔

(۶۶)

(د) نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

خفیف سے تغیر کے ساتھ یہی مضمون مندرجۂ ذیل شعر میں بھی باندھا ہے ؎

(ب) دلا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے نہ آہِ نیم شبی ہے

(۶۷)

(د) کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا　　پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

ایسا ہی مضمون دوسرے رُخ سے اس شعر میں بھی لکھا ہے ؎

(ب) کیوں نہ ہو بے التفاتی اس کی خاطر جمع ہے
جانتا ہے محوِ پرسش ہائے پنہانی مجھے

---

[1] کلیاتِ فارسی۔ ص۔ ۴۶۲۔

یہ مضمون فارسی میں بھی اس طرح کہا ہے ؎

(ج) باہمہ خرسندی ازوے شکوہ ہا دارم ہمی
تا نداند صید پُرسِش ہائے پنہانی مرا [1]

(۶۸)

(د) نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

دیکھیے مفہوم میں ذیل کا شعر اس شعر سے کس قدر مماثل ہے ؎

(ب) کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

یہی مضمون دوسری جگہ یوں کہا ہے ؎

(ج) ہر سنگ و خشت ہے صدفِ گوہرِ شکست
نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

تینوں شعروں کا مضمون یہ ہے کہ جنوں میں کوئی نقصان نہیں

(۶۹)

(د) مت مردمکِ دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں
ہیں جمع سویدائے دلِ چشم میں آہیں

یعنی میری آنکھ کی پتلی میں نگاہیں نہیں ہیں بلکہ یہ میری آہیں ہیں جو وسطِ چشم میں ایک جگہ مرکوز ہو کر سویدا یعنی دل کا سیاہ نقطہ سا بن گئی ہیں۔

ذرا پہلو بدل کر اس مضمون کو دوسری جگہ یوں کہتے ہیں ؎

(ب) حسرت نے لا رکھا تری بزمِ خیال میں
گلدستۂ نگاہ سویدا کہیں جسے

مطلب یہ کہ حسرت نے تیری بزمِ خیال یعنی میرے دل میں چند حسرت بھری نگاہوں

---

[1] کلیاتِ فارسی ۔ ص ۔ ۳۶۴ ۔

کا گلدستہ لاکر رکھ دیا ہے جسے سویدا کہتے ہیں۔

(۷۰)

(ا) ہے تجلّی تری سامانِ وجود ذرّہ بے پرتوِ خورشید نہیں

یہی مضمون ذیل کے شعر میں بالفاظِ دیگر دُہرایا ہے ؎

(ب) ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے

پرتو سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے

پہلے شعر میں کہتے ہیں کہ جس طرح پرتوِ خورشید سے ذرّہ کا ظہور ہوتا ہے خداوند تعالےٰ کی جلوہ گری وجودِ عالم کا باعث ہے اور دوسرے میں یہ کہ جس طرح آفتاب کے پرتو سے ذرّے میں جان پڑجاتی ہے خداوند تعالےٰ کے ذوق کی وجہ سے کائنات میں زندگی دوڑ رہی ہے۔ بنیادی طور پر دونوں شعر ہم مضمون ہیں۔

فارسی میں بھی یہ مضمون کہا ہے مگر دوسرے پیرایہ میں ؎

(ج) اے تو کہ ہیچ ذرّہ را جز بہرہِ تو روئے نیست

در طلبت توان گرفت بادیہ را بہ رہبری[1]

(۷۱)

(ا) کہتے ہیں جیتے ہیں امّید پہ لوگ ہم کو جینے کی بھی امیّد نہیں

اس کے ساتھ مرزا کا دوسرا ہم آہنگ شعر بھی ملاحظہ فرمایئے ؎

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید نا امیدی اس کی دیکھا چاہئے

(۷۲)

(ا) بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

ذیل کے شعر میں بھی باندازِ دیگر یہی مضمون جلوہ گر ہے ؎

(ب) چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

---

[1] کلیاتِ فارسی۔ ص ۔ ۵۳۶

(۷۳)

(د) تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر　　آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

یہ مضمون فارسی میں بھی کہا ہے لیکن دوسرے پہلو سے ؎

(ب) نارفتہ دم زوعدہ باز آمدن زند

تادر وصال یاد دہد اضطراب را[1]

(۷۴)

(د) غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی

پیتا ہوں روزِ ابروشبِ ماہتاب میں

یعنی چاندنی راتوں اور ابر آلود دنوں میں بے پیئے رہا نہیں جاتا۔

اس کے ساتھ دوسرا شعر ملاحظہ فرمایئے۔ اس میں کہتے ہیں کہ اگر دن کو ابر و ہوا نہ ہو اور اس لیے شراب نوشی میں کوئی لطف نہیں تو کیا پروا ہے چاندنی رات میں بھی تو لطف ہے ؎

(ب) کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا برائی ہے

بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں

(۷۵)

(د) ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند

گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

بالکل یہی مضمون فارسی کے مندرجۂ ذیل شعر میں بھی کہا ہے ؎

(ب) اے آنکہ از غرور بہیچم نمے خری　　زاں پایہ باز گوے کہ پیش از ظہور بود[2]

(۷۶)

(د) ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر　　یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

فارسی کے ایک قصیدے میں عقلِ فعال سے سوال و جواب کرنے کے دوران

---

[1] کلیاتِ فارسی۔ ص۔ ۳۷۰۔ [2] کلیاتِ فارسی۔ ص۔ ۴۲۳

اس کی زبان سے اس خیال کو اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

گفتم از کثرت و وحدت سخنے گوے برمز
گفت موج و کف و گرداب و ہمانا دریاست[1]

(۷۷)

(د) ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

ساقی نامہ (فارسی) میں بھی یہ مضمون ملتا ہے ؎

(ب) خیالے در اندیشہ دارد نمود ‏ ‏ ‏ ‏ ہماں غیب غیب است نزم شہود[2]

(۷۸)

(د) ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں ‏ ‏ ‏ ‏ غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

کہتے ہیں۔ اُسے مجھ سے نفرت ہے اس لیے اگر کوئی برائی کرنے کو بھی اس کے سامنے میرا نام لیتا ہے تو اسے ناگوار ہوتا ہے۔ میرا رقیب ہر وقت اس سے میری برائی کرتا ہے۔ عجب نہیں اسی سبب سے اس سے بگاڑ ہو جائے۔

یہی مضمون ذیل کے شعر میں دوبارہ دوسرے پہلو سے باندھا ہے اور الفاظ بدل دیئے ہیں۔ ؎

دشمنی نے میری کھویا غیر کو ‏ ‏ ‏ ‏ کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیے

یعنی رقیب نے میری دشمنی کرنے میں اپنے آپ کو مٹا دیا مگر دشمنی نہ چھوڑی۔ بظاہر ایک ہی مضمون سے دو گوشے نکال لیے گئے ہیں۔

(۷۹)

(د) شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم ‏ ‏ ‏ ‏ لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

اس کے ساتھ ان کا یہ دوسرا شعر دیکھیے ؎

(ب) ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی ‏ ‏ ‏ ‏ ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

---

[1] کلیاتِ فارسی۔ ص۔ ۲۲۹۔ [2] کلیاتِ فارسی۔ ص۔ ۱۶۴۔

دونوں شعر ہم مضمون ہیں ۔ عالم ہو یا ہستی موہوم و معدوم ہے ۔

اس مضمون پر دو اور شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

(ج) ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ   عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

(د) جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور   جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے

(۸۰)

(ل) میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمہیں

کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

ذیل کے شعر میں اسی مضمون کا رنگ صاف جھلکتا ہے ؎

(ب) ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام

قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

(۸۱)

(ل) صاف دُردی کشِ پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ

وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

فارسی میں یوں لکھا ہے ؎

(ب) ناداں حریفِ مستیٔ غالبؔ مشو کہ او   دُردی کشِ پیالۂ جمشید بودہ است[۱]

ان دو شعروں میں مضمون یہاں تک مشترک ہے کہ شراب نوشی میں جمشید کی تقلید کرتے ہیں گویا ادنےٰ درجے کی شراب نہیں پی سکتے ۔ پھر اردو شعر میں اس شراب پر افسوس ظاہر کرتے ہیں جو انگوری نہ ہو اور فارسی شعر میں اتنا اور بڑھا دیا ہے کہ ایسی شراب پینے والے غالبؔ کی مستی کا حریف ہونے کا دعویٰ کرنا نادانی ہے ۔

(۸۲)

(ل) دل لگا کر لگ گیا ان کو بھی تنہا بیٹھنا   بارے اپنی بیکسی کی ہمنے پائی دادیاں

---

[۱] کلیاتِ فارسی ۔ ص ۔ ۳۹۳ ۔

یہی مضمون دوسرے الفاظ میں ایک اور شعر میں اس طرح کہا ہے ؎

(ب) عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

پہلے شعر میں کہتے ہیں کہ کسی سے دل لگا کر وہ بھی ہماری طرح تنہائی پسند ہو گئے ہیں۔ ہماری بیکسی و تنہائی کا صبر پڑا اور ہمیں دنیا میں داد مل گئی۔ دوسرے میں فرماتے ہیں کہ محبوب خود کسی پر عاشق ہوا ہے۔ جو ستم اس نے ہم پر کئے ہیں اب وہی ستم اس کا محبوب اس پر کرے گا اور وہ اپنے جور و ستم کا بدلہ پائے گا۔ بنیادی طور پر دونوں شعر ہم مضمون ہیں۔

(۸۳)

(د) ترے جواہرِ طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

اس کے ساتھ ان کا دوسرا شعر بھی دیکھئے ؎

(ب) گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا
کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

مولانا آسی مرحوم بجا فرماتے ہیں کہ ذرا سے فرق سے دونوں مضامین میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا ہے۔ یہ مضمون فارسی میں بھی یوں کہا ہے ؎

(ج) گلے بر گوشۂ دستار داری خوشا بختِ بلندِ باغبانان[1]

(۸۴)

(د) آہ نے کس کا اثر دیکھا ہے ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

(ب) وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم
اثر فریادِ دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

دونوں شعروں میں یہ بات ظاہر کی گئی ہے کہ آہ یا نالہ و فریاد میں اثر نہیں پایا جاتا۔ دوسرے شعر میں اتنا اور اضافہ کیا گیا ہے کہ معشوقوں کی وفا

---

[1] کلیاتِ فارسی۔ ص۔ ۵۱۲۔

ایک اتّفاقی امر ہے ۔ اس سلسلے میں مرزا کا ایک اور شعر دیکھیے ۔ اس میں
ایک اور گوشہ نکال کر مضمون کو بلیغ کر دیا ہے ۔

(ج) بھلا اسے نہ سہی کچھ مجھی کو رحم آتا
اثر مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں

نفس یعنی آہ ! کہتے ہیں اگر اس کو میری بے اثر آہ رحم پر آمادہ نہ کرسکی
کم از کم اتنا تو ہوتا کہ میں اپنے آپ پر رحم کرتا اور نالہ کشی سے باز رہتا ۔
اپنے آپ کو تباہ نہ کرتا ۔

(۸۵)

(د) شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

اس شعر کا ذیل کے شعر سے مقابلہ کیجیے ؎

(ب) کہاں تک روؤں اس کے خیمے کے پیچھے قیامت ہے
مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

دونوں شعروں میں پتھر سے سر پھوڑ کر مرجانے کے لیے دیوار نہ ملنے پر حسرت
کا اظہار ہے ۔

(۸۶)

(د) گنجائشِ عداوتِ اغیار یک طرف — یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

یہ مرزا کے مندرجہ ذیل شعر کے مضمون کی ایک اور صورت ہے ؎

(ب) چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بارِ نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

دونوں شعروں میں شدّتِ ضعف کا بیان ہے جس کی وجہ سے اُن میں ہوسِ یار یا
تابِ اختلاط نہ رہی ۔

(۸۷)

(د) ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ — سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

انداز بیاں کچھ بدل کر یہی مضمون ذیل کے شعر میں بھی ادا کیا ہے ؎

(ب) گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر سو ہے

(۸۸)

(ل) طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

(ب) کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی
پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

پہلے شعر میں کہتے ہیں کہ ایسی جنت جہنم میں جائے جس کی نعمتوں (شہد اور شراب) کے لالچ میں عبادت کی جائے اور دوسرے میں یہ کہ ثوابِ اعمال کی طمع رکھنا بھی کچھ کم عیب نہیں۔ دونوں شعروں کا مطلب یہ ہے کہ عبادت خالص ہونی چاہیے۔

(۸۹)

(ل) نہیں گر ہمدمی آساں نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے
نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو

مرزا نے رشک کا یہ مضمون فارسی میں بھی اس طرح قلمبند کیا ہے ؎

(ب) یاد از عدو نیارم دیں ہم زدور بینی است
کاندر دلم گزشتن بادوست ہم نشینی اسد[۱]

(۹۰)

(ل) وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

یعنی وفاداری و پائداری ہر حال میں یہاں تک کہ کفر میں بھی اصلِ ایمان ہے۔

---

[۱] کلیات فارسی۔ ص۔ ۳۸۲۔

اسی مضمون کا دوسرا شعر ہے ؎

(ب) نہیں کچھ سبحہ و زنّار کے پھندے میں گیرائی

وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

(۹۱)

(ل) واں اس کو ہول دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار

یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو

یہ مضمون فارسی میں بھی کہا ہے ؎

(ب) دانش در انتظارِ غیر و نالم زار زار

وائے من گر رفتہ باشد خوابش از غوغائے من [۱]

اردو شعر میں کہتے ہیں کہ معشوق کو کوئی تکلیف ہوتی ہے تو عاشق اس خیال سے شرمندہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ اس کی آہوں کا اثر نہ ہو۔ فارسی شعر کا مفہوم یہ ہے کہ عاشق اس بات پر افسوس ظاہر کرتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہوا ہو کہ محبوب اس کی آہ و زاری کی وجہ سے نہ سو سکا ہو حالاں کہ وہ جانتا ہے کہ محبوب رقیب کے انتظار میں ہے اور اس وجہ سے جاگ رہا ہے۔ مضمون کی نوعیت ایک ہے۔

(۹۲)

(ل) جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امّید بھی ہو

یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

اس سے ملتے جلتے مضمون کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو ؎

(ب) تغافل دوست ہوں میرا دماغِ عجز عالی ہے

اگر پہلو تہی کیجے تو جا میری بھی خالی ہے

پہلے شعر میں کہتے ہیں کہ مجھے اپنا عاشق جان کر تغافل کرو تا کہ یہ امید ہو کہ کسی

---

[۱] کلیاتِ فارسی۔ ص۔ ۵۰۸۔

دن تم کو مجھ پر رحم آجائے گا اور مہربان ہو جاؤ گے۔ یہ ناآشنوں جیسی نگاہ میرے لیے زہر ہے۔ دوسرے شعر کا مفہوم یہ ہے کہ میرا دماغ عجز وانکسار میں اتنا بلند ہے کہ اپنے حق میں تمہارا تغافل ہی مجھے پسند ہے۔ مجھ سے پہلو تہی کرنا گویا میرے لیے جگہ خالی کرنا ہے۔ مطلب یہ کہ بے التفاتی ہی اپنے حق میں کرم سمجھوں گا۔ فارسی میں بھی یہ مضمون کہا ہے ؎

(ج) درآغوشِ تغافل عرض یکرنگی تواں دادن

تہی تامیکنی پہلو بما بنمودہ جا را[1]

(۹۳)

(ل) غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلّی کا

نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیوں کر ہو

(ب) میں نامراد دل کی تسلّی کو کیا کروں

مانا کہ تیرے رُخ سے نگہ کامیاب ہے

پہلے شعر میں کہتے ہیں کہ ہمیں خیال تھا کہ دوست کا خط آنے سے ہمارے دل کو تسلّی ہو جائے گی اور یہ غلط نہ تھا۔ دل کو تسلّی تو ہوئی دیدار طلب آنکھ دیدار سے بہرہ یاب ہوئے بغیر مطمئن نہ ہو تو کیا کیا جائے۔ دوسرے شعر میں دوسرے رُخ سے مضمون بیان کرکے یہ بتانا مطلوب ہے کہ اگرچہ دوست کے دیدار سے نگاہ لطف اندوز ہوئی لیکن دلِ نامراد کی تسلّی نہیں ہوئی۔ محض دیدار کافی نہیں۔ دوست سے ہم آغوش ہونے پر ہی تسلّی ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ دو شعروں کے مفہوم میں باوجود نوعیتِ مضمون مماثل ہونے کے تھوڑا سا فرق پایا جاتا ہے۔

(۹۴)

(ل) سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوّری

تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

---

[1] کلیاتِ فارسی۔ ص۔ ۳۵۷

یعنی حسینوں کو اپنی تصویر کھچوانے کا شوق ہوتا ہے۔ اس لیئے ملاقات کا موقع حاصل کرنے کے لیے ہم نے مصوری سیکھ لی ہے کبھی نہ کبھی وہ تصویر کھچوانے کے لیئے ہم کو بلائیں گے۔ یہ مضمون فارسی میں یوں کہا ہے ؎

(ب) خود را ہمی بہ نقش طرازی علم کنم تا با تو خوش نشینم و نظارہ ہم کنم[1]

(۹۵)

(ل) مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

اس کے ساتھ مرزا کا مندرجۂ ذیل فارسی شعر پڑھنا بے محل نہ ہوگا ؎

(ب) دریغ آگاہیٔ کافسردگی گردد سر و برگش
زمستی بہرہ جز غفلت نباشد ہوشیاراں را[2]

(۹۶)

(ل) مشکیں لباسِ کعبہ علی کے قدم سے جان
نافِ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے

یہ مضمون بھی فارسی میں کہا ہے ؎

(ب) از مکرمتش نافِ زمیں نافِ غزال است
مشکیں زچہ شد ورنہ لباسِ حرم آیا

(۹۷)

(ل) تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو
حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

یہی مضمون ذیل کے دو شعروں میں بھی ادا کیا گیا ہے۔ صرف الفاظ اور اندازِ بیاں میں کچھ فرق ہے ؎

۱؎ کلیاتِ فارسی۔ ص۔ ۵۰۱۔ ۲؎ کلیاتِ فارسی۔ ص۔ ۳۶۸

(ب) ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

(ج) پُر ہوں میں شکوہ سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

(۹۸)

(د) مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیٔ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدّعا مجھے

اسی مضمون کو فارسی میں یوں لکھا ہے ؎

(ب) بازگشتے نبود گر چہ بہوشم بخشند راہ صحرائے خیالِ تو چو مستاں رفتم [۱]

(۹۹)

(د) زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

یہی مضمون فارسی میں یوں باندھا ہے ؎

(ب) گفتنی نیست کہ بر غالبِؔ ناکام چہ رفت
میتواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت [۲]

(۱۰۰)

(د) زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے
دوسرے ایک شعر میں مرزا نے یہ مضمون زیادہ صاف الفاظ میں لکھا ہے البتہ
جیسا کہ مولانا آسیؔ مرحوم نے لکھا ہے یہاں پائے ثبات کہہ کر اور زیادہ نازک
مضمون کر دیا ہے ؎

ہوئے ہیں پانو ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

---

[۱] کلیاتِ فارسی۔ ص۔ ۳۰۸۔ [۲] دیوانِ غالبؔ اردو (نسخۂ عرشی)۔ شرحِ غالب (نوائے سروش)۔ ص۔ ۲۶۱۔

(۱۰۱)

(ا) ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے
آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

اسی خیال کو فارسی میں اس طرح ادا کیا ہے

(ب) مینائے از تندیٔ ایں مے بگدازد
پیغام غمت درخورِ تحویلِ صبا نیست[۱]

"فرق صرف یہ ہے کہ اردو میں اپنے دل کو مینا اور فارسی میں صبا کو مینا قرار دیا ہے۔ مصنّف کا یہ خاص انداز استادانہ ہے کہ جا بجا ایک ہی مضمون کو ادا کرتے ہیں مگر ذرا سے تغیر سے شعر کو نیا کر دیتے ہیں" (آسی)
اس سلسلے میں مرزا کا ایک اور فارسی شعر ملاحظہ فرمایئے۔ لطف سے خالی نہیں

(ج) سوز دز گرمیش مے وا دہ پنہاں بہ لہو
ریزد ز آبگینہ بہ ساغر شراب را[۲]

(۱۰۲)

(ا) دور چشم بد تری بزم طرب سے واہ واہ
نغمہ ہو جاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے

مرزا کا مندرجۂ ذیل شعر بھی اسی مضمون کا حامل ہے

(ب) ہمنشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست
واں تو میرے نالہ کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

دونوں شعروں میں مقصودِ کلام یہ ہے کہ محبوب عاشق کی نالہ کشی سے خوش ہوتا ہے۔

(۱۰۳)

(ا) سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے اسد
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

---

[۱] کلیاتِ فارسی۔ ص۔ ۳۸۱۔ [۲] کلیاتِ فارسی۔ ص۔ ۳۷۱۔

یہ مضمون ذیل کے شعر میں بھی دہرایا ہے ؎

(ب) وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں

دود کی طرح رہا سایہ گریزاں مجھ سے

ان دونوں شعروں میں سوزِ عشق کی بنا پر اپنے آپ کو آتش بجاں کہا ہے اور اپنے بدن سے سایہ کے دور ہونے کو آگ سے دھوئیں کے اڑ جانے کے ساتھ تشبیہ دی ہے ؎

اس مضمون سے ایک اور گوشہ نکال کر فارسی میں یوں کہا ہے ؎

(ج) ما ہمائے گرم پروازیم فیض از ما مجو ۔۔۔ سایہ ہمچوں دود بالا میرود از بالِ ما[۱]

یہاں اپنے آپ کو تیز اڑنے والے مبارک پرندے ہُما سے تشبیہ دے کر کہتے ہیں کہ پروں کا سایہ دھوئیں کی طرح اوپر کو اڑ جاتا ہے اور اس لیئے ان سے کسی فیض کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔

(۱۰۴)

(د) جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی

فتنۂ شورِ قیامت کس کے آب و گل میں ہے

فارسی میں بھی اسی انداز کا ایک شعر کہا ہے۔ دوسری تمثیل دے کر مضمون کو الگ کر دکھایا ہے ؎

(ب) بیخود بوقتِ ذبح طپیدن گناہِ من

دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہِ کیست[۲]

اردو شعر کا مطلب یہ ہے کہ مانا ہمارے دل میں دوزخ کی آگ بھری ہوئی ہے لیکن تم بھی تو سراپا فتنۂ حشر بنے ہوتے ہو۔ فارسی میں کہتے ہیں۔ قتل کئے جانے کے وقت تڑپ تڑپ کر جان دینا میرا قصور سہی لیکن چھری کو تیز نہ کرنے کے لیے کون ذمہ دار ہے ؟

---

[۱] کلیاتِ فارسی۔ ص۔ ۳۵۵۔ [۲] کلیاتِ فارسی۔ ص۔ ۳۸۲

(۱۰۵)

(ا) ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنّا پر کہ کس مشکل میں ہے

یعنی میرے دلِ دیوانہ کے طلسمِ پیچ و تاب میں تیری تمنّا بُری طرح پھنسی ہوئی ہے۔ اگر میری حالت پر نہیں تو اپنی ہی تمنّا پر رحم کر اور اسے قید سے آزاد کر۔ مطلب یہ کہ میرے دل کی تمنّا نکال دے۔
حضرت امتیاز علی عرشی نے مکمل کلامِ غالبؔ پر مشتمل جو ایڈیشن "نسخۂ عرشی" کے نام سے مرتب کیا ہے اس کے حصّۂ سوم موسوم "بہ یادگارِ نالہ" میں مرزا کا ایک شعر شامل ہے جو دوسرے پہلو سے اسی مضمون کا حامل ہے ؎

(ب) دل آپ کا کہ دل میں ہے جو کچھ سب آپ کا
دل لیجیے مگر مرے ارماں نکال کے

(۱۰۶)

(ا) پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں　　پھر وہی زندگی ہماری ہے
ایک اور شعر میں یہی مضمون یوں کہا ہے ؎
(ب) محبّت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

دونوں شعروں کا مطلب یہ ہے کہ جس پر مرتے ہیں اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں یا یہ کہ محبّت میں مرنا اور جینا ایک ہی بات ہے۔

(۱۰۷)

(ا) دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا　　آج پھر اس کی روبکاری ہے
مطلب یہ کہ دلِ عاشق اور مژگانِ یار کے درمیان جو مقدمہ تھا آج اس کی پیشی ہے کہ دونوں فریق اپنا اپنا دعویٰ اور جوابِ دعویٰ پیش کریں۔
اس کے ساتھ دوسرا شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

(ب) دل مدّعی و دیدہ بنا مدّعا علیہ نظارہ کا مقدّمہ پھر روبکار ہے

یعنی دل نے آنکھ پر یہ نالش کی ہے کہ نہ یہ نظارہ کرتی نہ میرا خون ہوتا۔ آج اس نظارے کے مقدمہ کی پیشی ہے۔

دونوں اشعار میں مضمون کی بنیاد ایک ہی خیال پر ہے۔

(۱۰۸)

(ا) یونہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا

کہ مرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی

فارسی کے ایک شعر میں یہ مضمون بھی ذرا سے تغیر کے ساتھ باندھا ہے ؎

(ب) دریغ از حسرتِ دیدار ورنہ جائے آں دارد

کہ بے رویت بدشمن دادہ باشم زندگانی را[۱]

اردو شعر میں کہتے ہیں کہ دشمن کو اپنی پُرمصائب زندگی اس لئے دینا نہیں چاہتے کہ بلاوجہ کسی کو دُکھ دینا اچھا نہیں۔ فارسی میں فرماتے ہیں کہ دیدارِ محبوب حاصل نہ ہونے کی صورت میں، چاہیئے تو یہ تھا کہ دشمن کو اپنی مصیبت زدہ زندگی دیتا لیکن حسرتِ دیدار ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔

(۱۰۹)

(ا) دیتے ہیں جنّت حیاتِ دہر کے بدلے

نشہ باندازۂ خمار نہیں ہے

فارسی میں کہتے ہیں ؎

(ب) جنّت نہ کند چارۂ افسردگیِ دل

تعمیر باندازۂ ویرانیِ ما نیست[۲]

اردو شعر کا مطلب یہ ہے کہ حیاتِ دہر کی تکلیفوں کی تلافی جنّت ملنے سے نہیں ہوسکتی جس طرح خمار کی بہت تکلیف اٹھانے پر تھوڑی سی شراب سے تسکین

---

[۱] کلیاتِ فارسی۔ ص۔ ۳۵۷۔ [۲] کلیاتِ فارسی۔ ص۔ ۳۸۰۔

نہیں ہو سکتی۔ فارسی شعر کا مفہوم بھی یہی ہے۔ کہتے ہیں دل کی افسردگی جنت میں جانے سے دور نہیں ہو سکتی۔ افسردگی کے مطابق ہماری تعمیر یعنی خوشدلی کی بحالی ممکن نہیں۔ دونوں شعروں کا مطلب ایک ہے۔ صرف تمثیل مختلف ہے۔

(۱۱۰)

(ا) چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

اسی مضمون کو فارسی میں یوں لکھا ہے ؎

(ب) بہ تن چپید بازم از زخم خونابہ پیراہن
خراشِ سینہ سطرِ بخیہ شد چاکِ گریباں را[1]

اردو شعر میں لہو کے نکلنے کی وجہ نہیں بتائی گئی ہے۔ فارسی میں خراشِ سینہ کا ذکر کر کے اس عیب کو دور کر دیا گیا ہے۔

(۱۱۱)

(ا) رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

اسی مضمون کی صدائے بازگشت ذیل کے شعر میں بھی سنائی دیتی ہے ؎

(ب) زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرم سے
آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے

(۱۱۲)

(ا) قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں سخت ارزاں ہے گرانی میری

یعنی جس طرح سنگِ راہ گراں ہونے کے باوجود اس لئے ارزاں ہے کہ راہ گیروں کے پاؤں سے روندا جاتا ہے اسی طرح میری گرانی بھی ارزاں ہے۔ کسی قدر مختلف اندازِ بیاں اختیار کر کے فارسی میں یوں کہتے ہیں ؎

---

[1] کلیاتِ فارسی۔ ص۔ ۳۷۱۔

(ب) ناکس ز تنومندیٔ ظاہر نشود کس

چوں سنگِ سرِ رہ کہ گراں است و گراں نیست [۱]

(۱۱۳)

(د) جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی

لکھ دیجیو یارب اسے قسمت میں عدو کی

فارسی میں اس خیال کو یوں قلمبند کیا ہے ؎

(ب) دریوزۂ راحت نتواں کرد ز مرہم غالبؔ ہمہ تن خستۂ یارا است گدا نیست [۲]

اُردو شعر میں کہتے ہیں۔ جو زخم قابلِ رفو ہو وہ دشمن کو نصیب ہو۔ مجھے تو وہ زخم چاہیئے جس میں ٹانکے نہ لگ سکیں۔ فارسی شعر کا مطلب یہ ہے کہ غالبؔ سراپا زخم خوردۂ محبت ہے۔ راحت کی دریوزہ گری کا خواہاں نہیں۔ بنیادی طور پر ان دو شعروں کے مضمون میں کوئی فرق نہیں۔

(۱۱۴)

(د) آغوشِ گل کشادہ برائے وداع ہے

اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے

بلبل سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ پھول آغوش کھولے ہوئے ہیں ان سے گلے مل کر رخصت ہو کہ بہار کے دن ختم ہو گئے ہیں۔

اس کے ساتھ دوسرا شعر ملاحظہ کیجئے ؎

(ب) چھڑکے ہے شبنم آئینۂ برگِ گل پہ آب

اے عندلیب وقتِ وداعِ بہار ہے

اس شعر کا مصرعۂ ثانی پہلے شعر کے مصرعۂ ثانی سے بالکل مطابقت رکھتا ہے۔ پہلے مصرع میں کہتے ہیں کہ شبنم پھولوں کی پتیوں کے آئینے پر پانی چھڑک رہی ہے۔ ایران میں رسم ہے کہ کسی کو رخصت کرتے وقت آئینہ پر پانی چھڑکتے ہیں کہ

---

[۱] کلیاتِ فارسی۔ ص۔ ۳۹۸ [۲] کلیاتِ فارسی۔ ۳۸۱۔

سفر کرنے والا بخیر و عافیت واپس آئے) اس شعر میں بھی بلبل ہی سے خطاب کرتے ہیں کہ بہار کے رخصت ہونے کا وقت آگیا ہے اور تیری خوشی کا زمانہ ختم ہو رہا ہے۔ ان دو شعروں کے مضمون میں کوئی خاص فرق نہیں۔ تھوڑے سے تفاوت کے ساتھ اسی رنگ میں یہ شعر بھی ملاحظہ کیجئے ؎

(ج) تا کجا اے آگہی رنگِ تماشا باختن   چشمِ وا گر دیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

یہاں بلبل سے مخاطب ہونے کے بجائے علم و معرفت سے خطاب کرکے کہتے ہیں۔ اے علم و معرفت! تو کب تک جلوۂ عالم کا تماشا دیکھنے میں محو رہے گی۔ تیری کھلی ہوئی آنکھ اس کے لیے آغوشِ وداع ہے یعنی جلوۂ عالم بے ثبات ہے۔

(۱۱۵)

(د) دوستی کا پردہ ہے بیگانگی   منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

یعنی منہ چھپا کر تم بیگانگی ظاہر کرتے ہو لیکن اس پردے میں لگاوٹ پائی جاتی ہے۔ پردہ کرنا چھوڑ دو اور جس طرح اوروں سے بے حجابانہ ملتے ہو ہم سے بھی اسی طرح ملو کہ ایک بے تعلقی ظاہر ہو جائے۔

فارسی میں یہ مضمون اس طرح بیان کیا ہے ؎

(ب) سے رمی از من و خلقے بگمانست ز تو
بے محابا شو و بنشیں کہ گماں برخیزد[۱]

یعنی تو مجھ سے دور رہتا ہے اس سے لوگوں کو کچھ اور گماں گزرتا ہے۔ بے تکلف ہو کر میرے پاس بیٹھ تاکہ ان کا یہ گماں جاتا رہے۔

(۱۱۶)

(د) غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے   چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

(ب) چاہتے ہیں خوبروں کو اسدؔ   آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

دونوں شعروں کا مفہوم یہ ہے کہ حسینوں کا چاہنے والا خود بھی خوبصورت

---

[۱] کلیاتِ فارسی۔ ص۔ ۴۲۰۔

ہونا چاہیئے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ دوسرے شعر میں اسلوب بیان طنزیہ ہے۔

(۱۱۷)

(ا) ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے   پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

فارسی میں دوسرے رُخ سے اس مضمون کو یوں بیان کرتے ہیں ؎

(ب) ہرچہ در سُو نتواں یافت بہ ہر سُو یابند

ہرچہ در جا نتواں دید بہ ہر جا بینند[۱]

(۱۱۸)

(ا) یہ باعثِ نو میدئ اربابِ ہوس ہے

غالبؔ کو بُرا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

مطلب یہ کہ غالبؔ ایسے عاشقِ صادق کو بُرا کہتے ہو۔ یہ کچھ اچھّا نہیں کرتے۔ اس سے بوالہوس رقیبوں کو مایوسی ہو گی کہ جب ایسے وفادار کو بُرا کہا جاتا ہے تو وہ کب اچھے سمجھے جائیں گے۔

یہی مضمون ذیل کے شعر میں بھی تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ دہرایا ہے ؎

(ب) ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے میرا

غالبؔ کو بُرا کیوں کہو اچھا مرے آگے

یہاں ادائے مضمون کا رُخ کچھ بدل دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ محبوب غالبؔ کو نہیں پہچانتا اور اس کے سامنے اس کی برائی کرتا ہے۔ اس لئے وہ کہتے ہیں کہ غالبؔ میرا ہمدم و ہمراز ہے اس کو بُرا کیوں کہتے ہو۔

(۱۱۹)

(ا) دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے

کر گئی وابستۂ تن میری عریانی مجھے

مطلب یہ کہ میں درپردہ ترکِ لباس یعنی دنیاوی تعلقات کو ترک کر کے

---

[۱] کلیاتِ فارسی۔ص۔ ۲۵۰۔

آزاد ہونا چاہتا تھا لیکن جب میری عریانی نے مجھے اس میں سرگرمِ عمل دیکھا تو اس نے مجھے وابستۂ تن کر دیا۔ غرض یہ کہ ترکِ تعلقات کے باوجود جسم کی پابندی سے آزاد نہ ہوا۔

اسی مضمون کو فارسی میں یوں کہا ہے ؎

(ب) فغاں کہ نیست سرو برگِ دامن افشانی

بہ بندِ خویش فرو ماندہ ام ز عریانی [1]

یہاں ذرا سے تغیر سے یہ خیال یوں ادا کرتے ہیں کہ افسوس کہ ترکِ تعلقات کے سامان و سائل سے محروم اور عریانی کے سبب سے عاجز و بے بس ہوں۔

(۱۲۰)

(د) اُدھر وہ بدگمانی ہے اِدھر یہ ناتوانی ہے

نہ پوچھا جائے ہے اس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

مطلب یہ کہ اُدھر اس کی بدگمانی ایسی ہے کہ میرے دعویٔ محبت کو جھوٹ سمجھتا ہے اور میرا حال نہیں پوچھتا اور اِدھر بیماریٔ محبت میں میری ناتوانی کا یہ عالم ہے کہ مجھ سے بولا نہیں جاتا۔

فارسی میں کہتے ہیں ؎

عشق است و ناتوانی، حُسن است و سرگرانی

جور و جفا نتابم، مہر و وفا ندارد [2]

یعنی عشق میں ناتوانی ہے اور حُسن میں سرگرانی۔ میں ظلم و ستم کی تاب نہیں لا سکتا اور اس میں مہر و وفا نہیں۔

(۱۲۱)

(د) کلفتِ افسردگی کو عیشِ بیتابی حرام

ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے

---

[1] کلیاتِ فارسی۔ ص۔ ۲۸۲۔ [2] کلیاتِ فارسی۔ ص۔ ۴۳۳۔

کہتے ہیں۔ افسردگی میں وہ کلفت ہے کہ بیتابی و اضطراب اس کے مقابلے میں عیش ہیں۔ مگر اس کلفت کے لئے یہ عیش بیتابی حرام ہے ورنہ ہم دل کو چبا ڈالیں اور اس میں زخم خنداں پیدا کر کے افسردگی کو نکال دیں۔
فارسی میں مضمون کو دوسرے پہلو سے بیان کرتے ہیں ؎

(ب) مپرس از عیشِ نومیدی کہ دنداں در دل افشردن
اساسے محکمے باشد بہشتِ جاودانی را[1]

یعنی یہ نہ پوچھ کہ ناامیدی میں کس قدر عیش ہے۔ جاودانی بہشت کو پانے کے لئے دل کو چبا ڈالنا مضبوط بنیاد ڈالنے سے کم نہیں۔

(۱۲۲)

(ا) ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ جب جہاں میں جامِ جم نکلے

یعنی اس زمانے میں شراب نوشی مجھ سے منسوب ہوئی کیوں کہ جمشید کے بعد میں ہی اس کا حریف ہوں۔ اب پھر وہ زمانہ آگیا ہے کہ جامِ جمشید کا نام جہاں میں مشہور ہو۔ فارسی میں یوں کہا ہے ؎

(ب) در من ہوسِ بادہ طبیعت کہ غالبؔ
پیمانہ بہ جمشید رساند نسبم را[2]

مطلب یہ کہ مجھ میں شراب کی ہوس ایک قدرتی بات ہے۔ شراب کا پیالہ میرے نسب کا سلسلہ جمشید تک پہنچا دیتا ہے۔

(۱۲۳)

(ا) نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

یعنی گمنامی اور کس مپرسی کی حالت میں کوئی دشمن اور بدخواہ نہیں ہوتا۔

---

[1] کلیاتِ فارسی۔ ص۔ ۳۵۷۔ [2] کلیات فارسی۔ ص۔ ۳۶۴۔

فارسی میں اس مضمون کو اس طرح کہا ہے ؎

(ب) بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلاست
قعرِ دریا سلسبیل و روئے دریا آتش است

اس شعر کا مصرعۂ ثانی عرفی سے لیا گیا ہے ۔

مندرجۂ صدر اشعار سے مرزا کے کلام میں تکرارِ مضمون کی مختلف صورتیں سامنے آجاتی ہیں ۔ ان چند اشعار سے قطع نظر کر کے جن میں بلا وجہ تکرار کا عیب پایا جاتا ہے سخن گوئی کی اس طرزِ خاص میں بھی ان کی چابک دستی اور قادر الکلامی مستغنی عن التوصیف ہے ۔